فہرست

مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۳۸

ماہ جولائی ۱۹۸۶ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامینِ معارف

جلد ۱۳۸

ماہ جولائی ۱۹۸۶ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

وفیات

ادبیات

مطبوعات جدیدہ

جلد ۱۳۸ ماہ ذی القعدہ ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۸۶ء عدد ۱

مضامین

مقالات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

جب سے بابری مسجد کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا ہے، اس وقت سے راقم کو اس کی جستجو ہے کہ بابر پر رام جنم بھومی کے مسمار کرنے کا جو الزام عائد کیا گیا ہے اس کا قدیم ترین ثبوت کہاں مل سکے گا، مغلوں کے دور کی کسی تاریخ میں تو اس کا ذکر کہیں نہیں ملا

البتہ برطانوی عہد میں ۱۸۸۱ء میں جو امپیریل گزیٹیر مرتب ہوا، اس میں ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر نے اجودھیا کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس میں ہے کہ اجودھیا سے دلچسپی اس کی قدیم تاریخ کی وجہ سے ہے، اس کا پرانا شہر بالکل غائب ہو چکا تھا، یہ کھنڈروں کا ڈھیر تھا یا جنگلوں میں گم تھا، لیکن قدیم زمانہ میں یہ ہندوستان کے عظیم ترین اور شاندار ترین شہروں میں تھا، کہا جاتا ہے کہ اس کا رقبہ چھیانوے [۹۶] میل تک پھیلا ہوا تھا، کوشل کی حکومت کا یہ دار السلطنت تھا، اس میں موجودہ دور کا اودھ بھی شامل تھا، یہاں سورج بنسی خاندان کے راجہ دسرتھ کا دربار تھا، رامائن کے ابتدائی ابواب کے مطالعہ سے اس شہر کی شوکت، یہاں کے فرماں رواکی شان اور یہاں کے لوگوں کی نیکی، دولت، اور اطاعت گذاری کا اندازہ ہوتا ہے، رام چندر دسرتھ کے بیٹے تھے، یہ رامائن کے ہیرو ہیں، سورج بنسی خاندان کے آخری فرماں روا کے مرنے کے بعد یہاں بودھوں کا تسلّط قائم ہو گیا تو اجودھیا پر زوال آگیا، لیکن جب برہمنیت کا از سر نو عروج ہوا تو بیان کیا جاتا ہے کہ راجہ بکرماجیت نے ۵۷ قبل مسیح میں اس شہر کی کھوج لگائی، اس کے مختلف مندروں، اور ان جگہوں کی نشاندہی کی جو رام سے منسوب تھیں، ان میں سب سے اہم مقام رام کوٹ تھا، جو راجہ کا قلعہ اور محل تھا، پھر ناگیشور مندر کا بھی پتہ چلایا گیا جو مہادیو کے نام پر تھا، مانی پربت کی پہاڑی کی بھی تلاش کی گئی، اسی طرح اور مندروں کا پتہ لگایا گیا۔

ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر آگے چل کر رقمطراز ہے کہ کوشل اس لیے بھی مشہور تھا کہ یہ بودھ مت اور جین مت کے پیروں کا ابتدائی مسکن تھا، اور ان کا دعویٰ تھا کہ یہیں ان کے بانی کی پیدائش ہوئی، ساتویں صدی میں چینی سیاح یہاں آیا تو اس نے اجودھیا میں بودھوں کے بیس [۲۰] مندر اور تین [۳] ہزار بھکشو دیکھے، ان ہی میں برہمنوں کی بھی بڑی آبادی تھی، اب بھی یہاں جینیوں کے کئی مندر ہیں جو ڈیڑھ سو برس کے اندر بنے ہیں، خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے پانچ [۵] مذہبی پیشواؤں کا یہ مولد بھی تھا،

اسی کے بعد ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر کا بیان ہے کہ جب مسلمانوں نے اس کو فتح کیا تو ان کی یادگاروں میں تین [۳] مسجدوں کے

کھنڈر ہیں، جو شہنشاہ بابر اور اورنگ زیب نے ہندوؤں کے مندروں کو توڑ کر ان کے ملبے سے بنوائیں، یہ تین [۳] مشہور مندر یہ تھے: (۱) جنم استھان جہاں رام چندر پیدا ہوئے تھے (۲) سوارگ دوار امندر جہاں رام چندر جلائے گئے (۳) تیرتا کا ٹھاکر جو اس لیے مشہور تھا کہ یہاں رام چندر نے بھینٹ چڑھائی تھی ...... اس شہر میں اس وقت تریسٹھ [۶۳] وشنو اور تینتیس [۳۳] شیو کے مندر ہیں، چھتیس [۳۶] مسلمانوں کی مسجدیں ہیں۔

یہ تو ابھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ بابر پر جو یہ الزام رکھا گیا ہے اس کے لیے یہی قدیم ترین تحریری ثبوت ہے، ممکن ہے کہ ایسی تحریر اس سے پہلے کی بھی ہو، مگر وہ کسی نہ کسی انگریز ہی کی ہوگی، ۱۸۸۱ء کے بعد فیض آباد کے جتنے گزیٹیر تیار ہوئے، ان میں یہی ساری باتیں دہرائی گئیں، ہنٹر نے اپنی سامراجیت پسندی میں مذکورہ بالا تحریر میں جو زہر پھیلایا ہے اس کا اندازہ اس کو بہت ہی غور سے مطالعہ کرنے کے بعد ہی ہو سکے گا، اس نے اس میں ہندوؤں، بودھوں، جینیوں اور مسلمانوں سب پر ضرب لگائی ہے، کیا یہ صحیح ہے کہ کوشل میں گوتم بدھ اور مہابیر پیدا ہوئے؟ پھر ہندوؤں کے مذہبی تخیل کی تحقیر یہ لکھ کر کی گئی ہے کہ وہ اجودھیا کو ایک مقدس شہر سمجھتے ہیں مگر یہ مقدس شہر جنگلوں میں گم ہو کر کھنڈر ہو چکا تھا، رام چندر کے کئی ہزار برس کے بعد اس کو پھر سے آباد کیا گیا، ان کی پیدائش جلانے اور قربانی کی جگہوں کو خیالی طور سے متعین کیا گیا، ان ہی خیالی جگہوں کو ہندو مقدس سمجھتے ہیں، اس تحریر میں یہ بھی ہے کہ یہاں پہلے بودھوں کی بیس [۲۰] عبادت گاہیں تھیں جن میں تین [۳] ہزار بھکشو رہتے تھے، اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب ۱۸۸۱ء میں یہ لکھی گئی تو وہاں نہ بودھوں کی عبادت گاہیں رہ گئی تھیں، اور نہ بھکشو دکھائی دیتے تھے، اس طرح یہ الزام ہندوؤں پر عائد ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اجودھیا سے ان کو ختم کیا۔

پھر ہندوؤں کو مسلمانوں سے یہ لکھ کر برگشتہ کیا گیا ہے کہ بابر اور اورنگ زیب دونوں نے ان کے مندروں کو مسمار کر کے ان کے ملبے سے مسجدیں بنوائیں، ایسے اہم بیان کے لیے کسی مستند ماخذ کا حوالہ دینا ضروری تھا، مگر جب شر انگیزی مقصود ہو تو مستند حوالہ کے بجائے قیاس آرائی زیادہ کارگر ہوتی ہے، پھر اوپر کی تحریر میں بابری مسجد کو کھنڈر ہی بنایا گیا ہے، یہ کوئی کیسے یقین کر سکتا ہے، جب یہ مسجد اپنی پرانی شان کے ساتھ کھڑی ہے اور اسی

کے لیے سارا قضیہ جاری ہے، پھر اس میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ یہ مسجد مندر کی جگہ یا اس کے قریب بنائی گئی، جب یہ یقین نہ تھا کہ مسجد مندر کی اصل جگہ پر بنائی گئی تو یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ اس کی جگہ کے قریب بنائی گئی، اس طرح کی تحریروں ہی سے فتنہ پیدا ہوتا ہے۔

خیریت یہ ہے کہ اب تک ہندوؤں کی طرف سے یہ دعویٰ نہیں کیا جا رہا ہے کہ اجودھیا میں جنم بھومی مندر کے علاوہ سوارگ دوار مندر اور تریتا کا ٹھاکر کی جگہیں بھی ان کو دلائی جائیں جہاں ہنٹر کے بیان کے مطابق دو اور مسجدیں بنائی گئی تھیں، ہندوؤں نے ان دونوں جگہوں کی واپسی کا مطالبہ اب تک نہیں کیا ہے تو اس کے کیا معنی نہیں کہ انگریزوں نے سنی سنائی روایتوں یا اپنی طرف سے من گھڑت باتیں لکھ کر ہندوؤں کے جذبات کو مشتعل کرنے کی کوشش کی، اور اس میں کامیابی حاصل کی۔

---

۲۱ - ۱۵ ار جون کے السٹریٹیڈ ویکلی میں ایک مضمون نگار چیدانند داس گپتا نے لکھا ہے کہ بنیاد پرست ہندو یہ کہتے ہیں کہ ہم رام اور سیتا کو آئیڈیل نمونے تسلیم کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، ہمارے مہنتوں نے ان کی جو پیدائش کی تاریخ اور ان کی پیدائش کی جو جگہ بتائی ہے ان ہی کو تاریخی حیثیت سے ہم کو تسلیم کرنا ہے اور اسی کے سہارے دوسرے فرقہ سے جنگ کر کے ان سے بازی جیت سکتے ہیں، یہ تسلیم کہ رام کی پیدائش کی جگہ کا ثبوت سائنٹفک طریقہ سے نہیں ملتا ہے، لیکن ہم کو اس کی پرواہ نہیں، بابری مسجد اور جنم بھومی کے جھگڑے سے جو جذبات ابھرے ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ تاریخ کی ساری کتابیں جلا دی جائیں، برہمن اس کی تاریخ پھر سے لکھیں گے، اپنی اس رزمیہ کو پھر سے سنائیں گے، پھر سے اس کی تعبیر کریں گے، اور اس میں طرح طرح کے اضافے بھی کریں گے، وہ اپنے پرانوں کو بھی پھر سے قلمبند کریں گے، اور اس کی پرواہ نہ کریں گے کہ تاریخی حیثیت سے ان کا کیا مقام ہے۔

اس ہٹ کے بعد پھر سارے معاملات کا تاریخی تجزیہ کرنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔

مقالات

قرآن کریم اور مستشرقین

ڈاکٹر التہامی نقرہ صدر شعبۂ قرآن و حدیث کلیۃ الزیتون تونس یونیورسٹی تونس،

ترجمہ

عبید اللہ کوٹی رفیق دار المصنفین

"مکتب التربیۃ لدول الخلیج" کی طرف سے "مناہج المستشرقین" کے نام سے دو جلدوں میں کتاب شائع ہوئی ہے، مستشرقین اور اسلام کے سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے اس کتاب کے مضامین کے ترجمے بھی ناشر اور مضمون نگاروں کے شکریہ کے ساتھ معارف میں شائع کئے جا رہے ہیں، ترجمہ میں مستشرقین کے جو نام آئے ہیں ان کو حتی الوسع صحیح لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اگر ان کے املا میں کوئی غلطی ہو گئی ہو تو ناظرین توجہ دلائیں، یہ دونوں جلدیں جناب محمد اجمل ایوب، استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ذریعہ سے ملیں جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

(معارف)

تحریک استشراق نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں شہرت حاصل کی، اس عرصہ میں مستشرقین نے اسلام کے دو بنیادی ماخذ (قرآن و حدیث)، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کتب و رسائل اور انسائیکلوپیڈیاز میں جو کچھ لکھا وہ فکر اسلامی کے ماہروں کے لیے بھی توجہ

کا سبب بنا۔

مسلمانوں میں تعلیم یافتہ طبقہ اپنی تربیت و تعلیم اور فکری رجحانات کے لحاظ سے یکساں نہ تھا، اس لئے ان کی مستشرقین کی طرف توجہ کے اسباب بھی مختلف تھے، ان کی اس توجہ میں تحسین و قدردانی اور ناپسندیدگی اور بے اطمینانی، دونوں کے اثرات نمایاں تھے۔

تاہم اہم اسباب درج ذیل ہیں۔

مستشرقین کی طرف توجہ کے اسباب

مسلمانوں کے ایک طبقہ میں اسلام، قرآن مجید اور پیغمبر اسلام کے بارے میں غیر مسلم مفکرین کے خیالات سے واقفیت کی خواہش پیدا ہوئی، مستشرقین نے اپنی مخصوص تعلیم و تحقیق اور پیشہ ورانہ کارکردگی کی روشنی میں مختلف پہلوؤں سے اسلام پر نظر ڈالی ہے، کچھ لوگوں نے تو فروعی مسائل ہی کو اپنی ساری جدوجہد کا محور بنایا یہاں تک کہ ان مسائل میں ان کو رہنمائی و قیادت کا منصب حاصل ہوگیا، ان کے ایسے شاگرد اور عقیدت مند بھی پیدا ہوگئے، جو ان کی رایوں سے ہی استدلال کرتے اور ان ہی کے طرز تحقیق کو اپناتے ہیں۔

۱۔ ہر ایک قوم کا یہ حق ہے کہ اس کے فرزندوں کو ان خیالات کا علم ہو جو دوسرے لوگ ان کے عقیدہ و اخلاق اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں ظاہر کیا کرتے ہیں۔ ان خیالات پر ان کو نقد و تجزیہ کا حق بھی حاصل ہے، ورنہ ان کی طرف سے خاموشی ان خیالات سے اتفاق کے ہم معنی ہوگی، پھر اگر ان خیالات کا اظہار، مغرب کے ترقی یافتہ مرکز سے ہو رہا ہو اور بحث و گفتگو کا محور وحی آسمانی ہو جو کتاب اللہ و سنت نبویؐ کی صورت میں موجود ہے۔ تو نقد و تجزیہ کے استحقاق اور اس کی ضرورت سے کسی صورت میں بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

۱۔ مستشرقین کے نتائج فکر و تحقیق سے مسلمانوں کی دلچسپی کی وجہ یہ ہے کہ ان کے شاگردوں نے مستشرقین کے معروضی انداز بحث و تحقیق کا بہت زیادہ پروپیگنڈہ کیا ہے، اس زمانہ میں عالم اسلام پس ماندہ اور ترقی کی جانب پیش قدمی کے لیے بے قرار تھا، مغربی یونیورسٹیوں کو علمی تحقیقات میں شہرت ملی انکے یہاں متون کی دریافت اور ان پر نقد و استقراء اور ان کے اسلوب تحریر میں، جو وقار و سنجیدگی نظر آتی ہے، اس کی وجہ سے عالم اسلام میں بھی اس طرح کی یونیورسٹیوں کے قیام و تاسیس کی خواہش پیدا ہوئی، چنانچہ یورپ کی یونیورسٹیوں میں عالم اسلام کی طرف سے وفود بھیجے گئے، اور عرب ممالک کی یونیورسٹیوں میں تدریس کے لیے ان مستشرقین سے تعاون لیا گیا، استفادہ کی غرض سے ان کی تحقیقات کو عربی میں منتقل کیا گیا، اور مصر، بغداد اور دمشق کی علمی و لسانی اکاڈمیوں میں ان کا تقرر کیا گیا۔

۲۔ عالم اسلام نے تحریک استشراق کی طرف اس کی تردید و دفاع کی غرض سے بھی توجہ کی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، اسلام اور قرآن پر متعصب مستشرقین کے اعتراضات اور الزامات واضح تھے، لیکن ان کے پس پردہ سامراجی مقاصد اور صلیبی جنگ کے رجحانات بھی کارفرما تھے، جن پر انھوں نے علمی تحقیق اور دین و دیانت کا پردہ ڈال رکھا تھا مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو زندگی اور علم کے مختلف میدانوں میں مغرب سے بہت زیادہ پیچھے رہ جانے کا صدمہ تھا، اس لئے مستشرقین کی یہ کوشش ہوئی کہ اسلامی تعلیمات کے وقار کو مجروح کردیں اور اسلام کے بارے میں شک و شبہہ کی ایسی فضا پیدا کردیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے۔

ایک مستشرق نے قرآن مجید کی آیت "والی اللہ المصیر" (سورۂ نور) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اسلام کا اللہ بظاہر اعلیٰ لیکن سخت گیر ہے، جب کہ مسیحیت کا اللہ مہربان اور متواضع ہے، وہ انسانی صورت میں ظاہر ہوا، وہ معبود فرزند ہے .... تثلیث کے مسیحی عقیدہ نے انسان کو اللہ سے قریب کر دیا ہے، اور توحید کے اسلامی عقیدہ نے دونوں کے درمیان فاصلہ پیدا کر کے، انسان کو خوف و اندیشہ میں مبتلا کر دیا ہے۔"[۱]

ایک فرانسیسی مستشرق کارادے فا (Carrade Vaux) کہتا ہے کہ

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک طویل عرصہ تک مغرب میں بدنام تھے، چنانچہ جو بھی بے سر و پا حکایت یا برائی ملتی وہ ان کی طرف بے تکلفی کے ساتھ منسوب کر دی جاتی۔"[۲]

اسلام اور پیغمبر اسلام پر یہودی اور مسیحی مستشرقین کی طرف سے یہ بامقصد حملے مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کے علاوہ بہت سے اہل مغرب کے ذہنوں پر بھی اثر انداز ہوتے رہے ہیں، چنانچہ ایک مستشرق کولی یہ بیان کرتا ہے کہ "اسلام کی بنیاد ہی تعصب اور طاقت پر ہے، وہ اپنے پیرووں کو لوٹ مار اور بدی کی اجازت دیتا ہے، اور جو لوگ جنگ میں مر جاتے ہیں انھیں جنت کی خوش خبری دیتا ہے"، یہی مستشرق صلیبی جنگوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"اور اس طرح ہلال کی قوت صلیبی علم کے سامنے پسپا ہو گئی، اور قرآن اور اس کے بیان کردہ اخلاق کے مقابلہ میں انجیل کو فتح حاصل ہوئی۔"[۳]

---

[۱] مجلۃ العالم الاسلامی The Muslim World اکتوبر ۱۹۵۵ء [۲] کتاب "محمدیہ" ص ۲۰۰ طبع پیرس ۱۸۹۱ء [۳] دیکھئے اس کی کتاب: البحث عن الدین الحق (عربی ترجمہ) ط ۱۹۲۸ء۔ مولف کو ۱۹۶۰ء میں پوپ ۱۳ سے خوشنودی کا پروانہ ملا اور مشرق و مغرب کی درس گاہوں میں اس کا نام آج تک زندہ ہے۔

مذکورۂ بالا قسم کی تحریریں دوسرے سنجیدہ مستشرقین کے حق میں بھی نقصان دہ ثابت ہوئی ہیں، چنانچہ اب اسلام کے بارے میں مستشرقین کی تحریروں کو احتیاط اور اندیشہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور ان میں نقائص کو معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

درمنگھم (E. Dermanghame) لکھتا ہے کہ

"اسلام اور مسیحیت کے درمیان صدیوں کی جنگ نے دونوں کے درمیان نفرت پیدا کی اور دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں غلطی کی، البتہ ہمیں یہ بات تسلیم کرنی چاہئے کہ مغرب کی طرف سے غلط فہمیاں پیدا کرنے کی زیادہ کوشش ہوئی ہے، ان سخت فکری مقابلہ آرائیوں میں مغرب نے واقعی تحقیق سے کام نہیں لیا، مستشرقین نے بازنطینی طریق بحث و مناظرہ کے ذریعہ اسلام کو اپنی ملامت کا نشانہ بنایا، پھر اس کے بعد مغرب کے وظیفہ یاب شاعروں اور مقالہ نگاروں نے عربوں پر مسلسل حملے کیے، ان کے یہ حملے بے بنیاد بلکہ متضاد الزامات کی صورت میں تھے۔"[۱]

۳۔ مستشرقین کی طرف مسلمانوں کی توجہ کا ایک مقصد ان علمی تاریخی اور لسانی غلطیوں کی نشاندہی تھی جو ان سے ناواقفیت، غلط فہمی، تنگ نظری یا بے بنیاد مفروضوں کے قائم کر لینے کی وجہ سے سرزد ہوئیں۔ مثلاً ان کا یہ دعویٰ کہ "حروف مقطعات کے مسئلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہود سے متاثر ہوئے ہیں" اور یہ الزام کہ "قرآن مجید آپ ہی کی تصنیف ہے"، مستشرقین اس حقیقت سے چشم پوشی کر گئے کہ یہ سورتیں (جن کا آغاز حروف سے کیا گیا ہے)، مکی ہیں، جہاں یہودی نہ تھے، مدنی سورتوں میں سے سورۃ البقرہ اور آل عمران کے سوا کسی بھی سورت کا آغاز حروف سے نہیں کیا گیا ہے، جب کہ مدینہ میں یہود موجود تھے، پھر ان حروف مقطعات پر یہودیوں کے

---

[۱] حیاۃ محمد ص ۱۲۵ ط پیرس ۱۹۳۷ء

اثر کی یہ منطق کیونکر صحیح ہو سکتی ہے۔

جرمن مستشرق نولدکی نے اپنی کتاب تاریخ القرآن میں حروف مقطعات کو قرآن مجید کا جزء تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مصحف عثمانی کی ترتیب سے پہلے مسلمانوں کے پاس جو نسخے تھے، یہ حروف مقطعات علامت کے طور پر درج کئے گئے تھے مثلاً حضرت مغیرہؓ کے مجموعہ کے لئے حرف میم حضرت ابوہریرہؓ کے نسخہ کیلئے حرف ہا، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے صحیفہ کے لیے حرف صاد صحیفہ حضرت عثمانؓ کے لئے حرف نون، چنانچہ نولدکی کے نزدیک یہ حروف مختلف مجموعوں کی ملکیت کی علامت تھے، جو غلطی سے مصحف عثمانی کی بعض سورتوں کے آغاز میں باقی رہ گئے، اور طول مدت کے ساتھ وہ قرآن کا جزء بن گئے۔

نولدکی کو اگرچہ بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا، لیکن .... دوسرے مستشرقین اس کی مذکورہ بالا رائے ہی کو نقل کرتے رہے، حالانکہ ان سچے مسلمانوں کے ساتھ جنھوں نے قرآن مجید کے مختلف نسخوں کو نقل کیا ہے، بڑی ناانصافی اور زیادتی ہوگی، اگر ہم ان پر غفلت یا قرآن مجید میں .... دوسروں کے کلام کے اضافہ کا الزام عائد کریں۔[1]

۴۔ مستشرقین کی طرف توجہ کا ایک سبب، ان کی تحقیقات سے استفادہ بھی تھا، کلیسا کے طریق کار کے دباؤ سے آزاد ہونے کے بعد مستشرقین کی جو تحقیقات منظر عام پر آئی ہیں اُن میں کلیسا کے عائد کردہ احکام کی پیروی یا سامراجی مقاصد کی تکمیل پیش نظر نہ تھی، ان تحقیقات کا انداز خالص علمی ہے، مستشرقین کا یہ جدید نقطۂ نظر معروضیت، انصاف اور تحقیق و استقراء کے اصولوں کے مطابق ہے، اگرچہ استشراقی مطالعہ کا فکری غلطیوں اور صدیوں کے نسلی اثرات سے محفوظ رہنا یا معمولی جدوجہد سے ان اثرات کو مغلوب کر لینا آسان نہ تھا، لیکن تحقیق میں

[1] نظرات استشراقیہ فی الاسلام۔ ص ۳۴ ۔ ط قاہرہ۔

ان سے آزاد رہنے کی یہ کوشش، ان کے تحقیقی کاموں میں پختگی کا سبب بنی اور اس سے مستشرقین کے بارہ میں شک و شبہ کے ازالہ میں بھی مدد ملی۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کو مستشرقین نے کئی زبانوں میں شائع کیا ہے، اور اس میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دی ہیں، تاہم چند در چند تحریفات اور خلط مباحث کے باوجود وہ مسلمانوں کے لیے بھی ایک اہم علمی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

بہرحال وجہ کچھ بھی ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ مستشرقین نے اپنی تحقیقات کے ذریعہ علوم اسلامیہ کی ترقی میں قابل قدر حصہ لیا ہے، اور ان میں اضافہ، نظر ثانی اور معترضانہ مباحث کے ذریعہ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، ان میں سے چند دیانت دار مستشرقین نے عالم اسلام اور مغربی دنیا کے علمی ماحول پر گہرا اثر ڈالا ہے، مثلاً کلود اتیان سافاری (Claude Etienne Savary) نے قرآن مجید کے اپنے ترجمہ کے مقدمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام و تعظیم کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک ایسے عالمی مذہب کی بنیاد ڈالی جو سادہ عقیدہ پر مشتمل ہے، ایک اللہ پر ایمان جس کو عقل تسلیم کرتی ہے، وہ نیکی پر جزا اور بدی پر سزا دیتا ہے، مغرب کا کوئی روشن خیال محمدؐ کی نبوت کو تسلیم نہ کرے تب بھی وہ ان کو تاریخ انسانی کے عظیم ترین افراد میں شمار کرنے پر مجبور ہے۔“[1]

اسی طرح انگریز مستشرق تھامس کارلائل اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ

اس زمانہ میں ایک پڑھے لکھے آدمی کے لیے یہ بات شرمندگی اور عیب کا باعث ہوگی اگر وہ اس خیال کی طرف توجہ کرے کہ ”دین اسلام غلط ہے اور محمدؐ ایک فریب

Le Coran. 2, ed Peris 1783

شخص تھے۔ کیونکہ انھوں نے جو پیغام دیا وہ بارہ صدیوں سے ہمارے جیسے کروڑوں لوگوں کے لئے روشن چراغ بنا ہوا ہے، ان لوگوں کو اسی اللہ نے پیدا کیا ہے جس نے ہم کو پیدا کیا ہے، کیا یہ بدگمانی کی جاسکتی ہے کہ محمدؐ نے اپنی زندگی میں جو پیغام دیا۔ جس پر کروڑوں آدمی عمل کرتے رہے وہ محض ایک فریب تھا، جہاں تک میرا تعلق ہے تو یہ خیال کبھی میرے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔

..... اگر اللہ کی مخلوق میں غلط بیانی اور فریب کو اس قدر شہرت حاصل ہونا ممکن ہو اور انسانی عقل اس کو اس قدر آسانی سے قبول کر لیتی ہو تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمام انسان بے وقوف ہیں، زندگی کا یہ سارا کھیل عبث اور بے معنیٰ ہے۔ اس سے کہیں زیادہ بہتر تو یہ تھا کہ ایسی زندگی کا وجود ہی نہ ہوتا"۔[1]

کارلائل نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا جائزہ لیکر آپ کے نبوغ و کمال کے مختلف پہلوؤں پر وحی کے اثرات کی نشاندہی کی ہے، اور پھر اس نے اپنی بحث و گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے، کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دوسرے عظیم اور مومن افراد کی طرح اپنی دعوت میں مخلص اور اپنے عقیدہ میں سچے تھے۔

تحریک استشراق نے کلیسا کی نگرانی اور رہنمائی میں ترقی کی ہے، اس نے سامراج کے سیاسی، تہذیبی اور فوجی مقاصد کی تکمیل میں اہم رول ادا کیا ہے، اس نے اپنی جدوجہد سے محکوم قوموں میں اپنے مذہب اور تہذیب کی طرف سے بے اعتمادی پیدا کی ہے لیکن اس کے باوجود تحریک استشراق کا ایجابی پہلو بھی قابل قدر ہے، مستشرقین نے یورپ کی پبلک لائبریریوں میں

---

[1] Thomas Garlyle on Heroes Heroes-Wors-hip and The Heroic in History- London- 1849

عربی کتابوں کی تنظیم نو کی، ان کی فہرستوں کو مرتب کیا، تحقیق و اشاعت کے لیے اہم قلمی نسخوں کی دریافت کی، انھوں نے بعض جزئی مسائل پر تحقیق کے لیے بھی لائق علماء کو مقرر کیا، جنھوں نے طویل صبر آزما جدوجہد کے بعد خاص خاص موضوعات پر یکسو ہو کر اپنے تحقیقی نتائج کو شائع کیا، ان میں سے بعض مستشرقین نے تو ان ہی تحقیقات کی بنا پر شہرت پائی، چنانچہ ماسینیون (Mass-ignon) کو حلاج پر اور لاؤوسٹ (Laoust) کو ابن تیمیہ پر اپنے تحقیقی کاموں کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔

نولدیکی (Noeldeke) بلاشیر (Blachere) جیفرے (Teffnay) اور گولڈزیہر (Goldziher) کو قرآن اور علوم قرآن کے مطالعہ کی وجہ سے شہرت ملی، اس پر ان میں سے ہر ایک نے کئی کئی کتابیں لکھیں، ان علمی خدمات کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے، ان کے یہاں جو پہلو قابل قدر ہیں ان کا اعتراف ضروری ہے، اور جہاں ان سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ان کی نشاندہی اور تردید ہونی چاہیئے۔

قرآن مجید پر مستشرقین کے مطالعہ و تحقیق کا جائزہ ...... وقت کی ایک اہم ضرورت ہے، اس طرح ہم ان اعتراضات سے بھی واقف ہونگے جو مستشرقین نے قرآن مجید پر کیے ہیں، اور خالص علمی طریقہ پر ان کی تردید اسلام اور قرآن مجید کی ایک بڑی خدمت تصور کی جائے گی۔

اب ہم قرآن مجید پر مستشرقین کی تحقیقات کا تنقیدی جائزہ لیں گے تاکہ ان کی واقعی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے، اس کے علاوہ مستشرقین نے قرآن مجید کے بارے میں جن الزامات یا شبہات کا ذکر کیا ہے، ہم ان پر بھی اپنے خیالات درج کریں گے، یہ قرآن اور اسلام کی خدمت ہوگی، اور اس سچائی کی بھی خدمت ہوگی جس کے نام پر مستشرقین نے اپنی علمی جدوجہد کا آغاز کیا ہے۔

قرآن کا سرچشمہ | مسلمانوں کے درمیان اس مسئلہ میں باہم کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قرآن مجید

قلب رسول پر وحی کے ذریعہ نازل ہوا ہے، اللہ تعالےٰ ہی اس کلام کے متکلم ہیں، چنانچہ مختلف آیتوں میں ضمیر متکلم ذات الٰہی ہی کی طرف اشارہ کرتی ہے، مثلاً

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَا　　ہم ہی نے انسانوں کو پیدا کیا ہے

اَسْرَهُمْ (دھر - ۲۸)　　اور ہم ہی نے انکے جوڑ بند مضبوط کئے ہیں

دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلہ میں قرآن کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے لفظ و معنی دونوں کے اعتبار سے ربانی ہے، بائبل (عہد عتیق اور عہد جدید) میں نبی کے پاس جو وحی آتی وہ اسے اپنے الفاظ میں لوگوں تک پہنچاتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کہکر اور حضرت عیسیٰؑ نے اپنا بھائی کہکر لوگوں سے خطاب کیا،

قرآن مجید میں اللہ کی موجودگی ضمیر متکلم کے ذریعہ پائی جاتی ہے، جب کہ تورات و انجیل میں اللہ مخاطب کی حیثیت سے موجود ہے، جس کی طرف دعا و مناجات میں توجہ کی گئی ہے، یا وہ ایسی غائب ہستی ہے جس کے بارے میں بیانیہ انداز یا تعارفی طریقہ اختیار کیا گیا ہے تاکہ لوگ اس سے متعارف ہوں اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دی جائے، دوسری آسمانی کتابوں میں یہ امتیاز صرف قرآن ہی کو حاصل ہے کہ وہ کلمۃ اللہ (اللہ کا بول) ہے۔ اس میں اللہ نے نئے اور انوکھے انداز سے پیرایہ بدل بدل کر بار بار فصاحت و بلاغت کے ماہرین کو یہ چیلنج کیا ہے کہ وہ اس کی طرح کوئی ایک سورت ہی پیش کریں، لیکن تقریباً تمام ہی مستشرقین اس بات پر متفق ہیں، کہ قرآن اللہ کی طرف سے منزل نہیں ہے، اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کا مواد یہودی عالموں اور عیسائی راہبوں سے حاصل کیا تھا جن کے ذریعہ وہ عہد عتیق اور عہد جدید کی دینی معلومات حاصل کیا کرتے تھے۔

دراصل قرآن مجید کے سرچشمہ کی جستجو کا مسئلہ بنیادی طور پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے

اقرار سے وابستہ ہے، اس لئے کہ آپ کی نبوت سے انکار کا ایک ہی نتیجہ ہوگا، اور وہ ہے قرآن کا انسانی کلام ہونا لہذا ہم کو اسی نکتہ پر اپنی توجہ مرکوز کرنی ہوگی،

اسلامی عقیدہ کے مطابق نبی وہ ہے جس کی طرف اللہ نے اپنی وحی بھیجی ہے، اس وحی کی تبلیغ کا حکم بھی دیا گیا ہو تو وہ شخص رسول ہے، جو اللہ کی طرف سے خبر پاتا اور اس خبر کو اللہ سے پاکر دوسروں تک پہنچاتا ہے، جو وحی اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری وہ آپ کی بلند نفسیاتی استعداد سے ابل پڑنے والا الہام نہ تھا، ورنہ یہ کہا جاتا کہ آپ کے معلومات، خیالات اور آرزوؤں نے آپ کی باطنی عقل یا روحانی نفس سے ابل کر قوت خیالیہ میں... آپ کے لیے الہامات پیدا کر دیئے ہیں، یا یہ کہ آپ کا یقین و اعتقاد ہی نگاہوں کے سامنے منعکس ہو گیا ہے، چنانچہ آپ نے اپنے سامنے ایک فرشتہ کو کھڑا ہوا دیکھا، یا وہ اعتقاد گوش گزار ہوا، جس کی وجہ سے آپ نے فرشتہ کی باتوں کو یاد رکھا، کچھ مستشرقین نے اپنے قیاسات کی مدد سے ایسا ہی منظر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔[1]

ہمارے اور مستشرقین کے درمیان اختلاف کی بنیاد یہی ہے، کہ وحی نبی کے پاس باہر سے آتی ہے، وہ اس کی داخلی کیفیات سے پیدا نہیں ہوتی، اور پھر یہ بات کہ خارج میں بھی روحانی فرشتہ موجود ہے، جو حقیقت میں اللہ کی طرف سے آکر، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ　　اور قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ　　ہے، اس کو امانت دار فرشتہ

عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ　　لیکر آیا ہے آپ کے قلب پر صاف

---

[1] محمد رشید رضا - الوحی المحمدی: - ۳۹ - ط مصر ۱۹۳۹ء

بلسانٍ عربیٍ مبین۔ عربی زبان میں، تاکہ آپ (بھی)

(شعراء ۱۹۲/۱۹۵) منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں۔

نبی کی طرف وحی آتی ہے، وہ اس یقین سے سرشار اور مطمئن ہوتا ہے کہ یہ وحی خواہ بالواسطہ ہو یا براہ راست، سنی جانے والی آواز کے ذریعہ ہو، یا بغیر آواز کے، وہ یقیناً اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

باب نبوت کسی کے لیے کھلا ہوا نہیں ہے، کسی... کی اشراقی قوت خواہ کتنی ہی زبردست ہو یا اس کے نفس کو ریاضتوں نے کتنی ہی بلندیوں تک پہنچا دیا ہو، مگر نبوت انسان کی ذاتی صلاحیتوں اور نفس کی ریاضتوں سے بلند تر ہے، وحی اپنے صحیح اور مذہبی مفہوم کے لحاظ سے ایک روحانی شئی ہے، جس کے ذریعہ اللہ اپنے بندوں میں سے ان ہی کو ممتاز کرتا ہے، جنھیں وہ نبوت کے لیے چن لیتا ہے، اور اس نبوت کے ذریعہ ان کا اللہ سے جو تعلق پیدا ہوتا ہے، وہ نہ حلول کا ہے اور نہ ہی اتحاد کا، اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اس طرح وہ اس کی ہدایات کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے ذمہ دار ہو جائے۔

مسیحیت کے نزدیک غالباً وحی کے معنی، روح الٰہی کے اس فرد میں تحلیل ہو جانے کے ہیں جس کی طرف وحی نازل کی گئی ہے، وہ مسیحؑ کو حلول کے اس عقیدہ ہی کی وجہ سے تو الٰہ قرار دیتے ہیں کیونکہ جس کی ذات میں روح الٰہی حلول کر جائے وہ الٰہ بن جائے گا۔ اسلام اس مفہوم کی قطعی طور پر نفی کرتا ہے، اس لئے کہ اللہ کی ذات نہ اپنے غیر میں حلول کرتی ہے، اور نہ ہی خدا کی ذات میں کوئی غیر حلول کر سکتا ہے۔

کچھ مستشرقین وحی اور نبوت کے بارے میں اس ڈھنگ سے باتیں کرتے ہیں جیسے کہ وہ درویشی یا درویشوں کے بارے میں باتیں کرتے ہوں یا ماہرین نفسیات

عظیم افراد، تاریخی ہیروز اور انقلابی رہنماؤں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوں، یا جس طرح بعض خاص خاص افراد، آنکھوں یا کانوں کی مخصوص داخلی خصوصیات کی وجہ سے ممتاز ہو جاتے ہیں، اور ایسی آوازیں سن لیتے یا ایسے مناظر دیکھ لیتے ہیں جن کو عام انسان اپنی سماعت یا بصارت کی گرفت میں نہ لے سکتے ہوں اس طرح کے حالات و واقعات ہی کی روشنی میں انسانوں نے مذہبی تجربات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔[۵۱]

وحی قرآنی کے بارے میں مستشرقین کے درج ذیل اقوال سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

جرمن مستشرق ہوبرٹ گرمی (Hubert Grimme) اپنی کتاب[۵۲] "محمدؐ" میں لکھا ہے۔

> محمدؐ ابتدا میں کسی نئے دین کے داعی نہ تھے، وہ ایک نوع کی اشتراکیت کی طرف دعوت دیتے رہے۔ اسلام کو اس کی اصل ابتدائی شکل میں سمجھنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اس سے پہلے کے کسی دین پر نظر ڈالیں جو اسلامی تعلیمات کی وضاحت میں معاون ہو، کیونکہ اسلام کا براہ راست مطالعہ ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتا ہے کہ وہ ایک دینی عقیدہ کے بجائے ایسی اجتماعی اصلاحی جدوجہد کی صورت میں سامنے آیا، جس کے پیش نظر بگڑے ہوئے حالات میں تبدیلی، اور خصوصاً حریص دولت مندوں اور پریشان حال غریبوں کے درمیان واضح فرق کو مٹانا تھا، یہی وجہ ہے کہ ہم ان کو ضرورت مندوں کی مدد کے لئے، ایک متعین ٹیکس عائد کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی دعوت کی تائید اور لوگوں پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے

---

[۵۱] انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز ط ۱۹۵۶ء جلد ۱۳ ص ۲۳۰ ۵۲

[۵۲] Mohamed. 1892

اُخروی محاسبہ کے نظریہ کو استعمال کرتے رہے۔[1]

گرلیبی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اشتراکیت کا داعی اور ایک اجتماعی مصلح ثابت کرنے کے لئے کس قدر سادہ دلی سے نبوت کی نفی کر رہا ہے، دلیل و ثبوت کے بغیر نبوت کی واضح علامتوں سے صرف نظر کرنا کس قدر غیر علمی بات ہوگی، اس پر شاید اس نے زیادہ غور نہیں کیا۔

انگریز مستشرق گب (Gibb) جو امریکہ کی ہارڈ یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کے مطالعاتی شعبہ میں پروفیسر تھے۔ لکھتے ہیں کہ[2]

"محمدؐ نے ہر ایک انوکھی شخصیت کی طرح اگر ایک طرف اپنے گرد و پیش کے خارجی ماحول کا اثر قبول کیا تو دوسری طرف انھوں نے اپنے زمانہ کے عقائد و افکار سے اور ان خیالات کی مدد سے جن میں ان کی نشو و نما ہوئی تھی ایک نئی راہ نکال لی" مکہ کے اس زمانہ کے ماحول کا اثر، محمدؐ کی زندگی کے ہر دور میں نمایاں ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمدؐ کامیاب ہوئے، کیونکہ وہ مکہ ہی کے ایک فرد تھے"۔

گب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "یہ بات بھی واضح ہے کہ اہل مکہ کی طرف سے محمدؐ کی مخالفت کی وجہ قدیمی روایات سے ان کی وابستگی نہ تھی، اور نہ ہی یہ بات کہ محمدؐ پر ایمان لانے سے انھیں کوئی دلچسپی نہ رہی ہو، اس مخالفت کے پس پردہ زیادہ تر سیاسی و اقتصادی اسباب کارفرما تھے۔

گب کی مذکورہ بالا رائے پڑھنے کے بعد ہمیں اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ جو شخص تاریخ دیر کے متفق بیانات سے اختلاف کرنے کی جرأت کرتا ہو، اور وہ اطمینان بخش دلیلیں نہ پیش کر سکے اس کے لیے اپنے نجی خیالات اور ذاتی رجحانات سے آزاد ہو کر بحث و تحقیق کرنا ممکن نہیں ہے۔

---

[1] محمد کامل عیاد - مجلہ مجمع اللغۃ العربیہ دمشق - ج ۳ م - ۴۴ - اکتوبر ۱۹۶۹ء ص ۱۹۲

[2] Mohomedanismism P. 27

درمنگھم نے اپنے تخیل کی مدد سے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں خوبصورت شاعرانہ اسلوب میں اپنے داخلی جذبات کو قلمبند کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نبی و رسول کے بجائے، کسی فطری آرٹسٹ یا کسی پیدائشی عبقری کی تصویر پیش کر رہا ہو، وہ لکھتا ہے کہ۔

"موسم گرما کی صحرائی راتوں میں یہ بے شمار تارے خوب دمک رہے ہیں، آدمی یہ سوچنے لگتا ہے کہ شاید وہ ان کی روشنی کی آہٹ سن رہا ہو یا شاید دھکتے ہوئے انگاروں نے کوئی ساز چھیڑ دیا ہو۔

سچ تو یہ ہے کہ آسمان میں داناؤں کے سمجھنے کے لیے کچھ راز پنہاں ہیں، اور عالم میں کچھ حقیقتیں پردہ کئے ہوئے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ سارا عالم ہی ایک غیب ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ انسان اپنی آنکھیں کھول کر سب کچھ دیکھ لے، وہ اپنے کانوں کو متوجہ کرے اور پھر سن لے، حق کو دیکھے اور نہ فنا ہونے والی آوازوں کو سن لے انسانوں کے پاس آنکھیں تو ہیں، مگر وہ دیکھ نہیں سکتیں، کان ہیں مگر وہ نہیں سنتے، لیکن ان کا (محمدؐ) خیال یہ ہے کہ وہ دیکھتے اور سنتے ہیں، آسمان کے پردہ میں جو آوازیں گونج رہی ہیں، کیا، ان کی طرف دھیان دینے کی انھیں کبھی ضرورت ہے۔؟ اس کے لئے تو ایسا ہی دل چاہئے جو مخلص ہو اور ایمان سے لبریز ہو۔[3]

مستشرقین کے ان اقوال سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں، کہ وہ وحی اور نبوت کی حقیقت سے ناواقف ہیں، ان دونوں کے درمیان باہمی رشتہ کو سمجھے بغیر جو شخص اپنے نظریات اور تجرباتی علوم کی مدد سے وحی اور نبوت کو جانچنے کی کوشش کرے گا۔ وہ وحی اور نبوت کی حقیقت سے بے گانہ ہی رہے گا۔ وحی آسمانی پر ایمان لانے والوں اور اس کو تسلیم نہ کرنے والوں کے درمیان اختلاف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے نزدیک وحی کا مفہوم جداگانہ ہے۔

---

[3] محمد رشید رضا - الوحی المحمدی - ص ۹۱ -

جدید و قدیم علمائے دین اور فلاسفہ نے اس مسئلہ پر بحث و تحقیق کے بعد وحی کے وجود کو تسلیم کیا ہے، انھوں نے شرعی مفہوم کے مطابق وحی کے امکان پر دلیلیں پیش کی ہیں اور وحی سے انکار کرنے کے لیے جو شبہات اور دعوے کئے گئے ہیں، انھوں نے ان میں سے ہر ایک کا جواب دیا ہے، اب وحی آسمانی کے بارے میں تحقیق نے یہ بات متعین کر دی ہے کہ وہ مقدس چیز ہے، اور ایسی سچائی ہے جس میں باطل کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔

مستشرقین نے نفسیاتی تجزیہ کے ذریعہ وحی الٰہی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، وحی کی آمد کے موقع پر نبی جسمانی بشریت سے جدا ہو کر اور روحانی پیکر میں جس مخصوص کیفیت سے دوچار ہوتا تھا مستشرقین نے اس کو جنون کی ایک قسم قرار دیا ہے، یہ خیال حقیقت نبوت سے تمام تر ناواقفیت کی پیداوار ہے، کیا کسی ایک علم کے اصول و معیار دوسرے علوم کے لیے بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں، علمی بحث و تحقیق کا کوئی بھی طریقہ اس قدر ترقی یافتہ نہیں ہے کہ اسے اپنے حدود سے باہر بھی معیار تسلیم کیا جا سکتا ہو، گستاف لیبان' اسلام، نبی کی شخصیت اور قرآن پر اپنی متوازن تحریروں کے لیے ممتاز اور معروف ہے۔ لیکن کوئی بھی مذہبی عالم، اس فرانسیسی مستشرق کے درج ذیل خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ

"ایک خیال یہ ہے کہ محمدؐ پر صرع کا اثر تھا، لیکن اس بات کا قطعی فیصلہ کرنے کے لیے مجھے، تاریخ عرب میں کوئی دلیل نہیں ملی، ان کے ہم عصر لوگوں سے جن میں ایک عائشہؓ بھی ہیں، صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ محمدؐ پر جب وحی آتی تو پیشاب رک جاتا، سخت دباؤ محسوس کرتے، دہن سے لعاب ظاہر ہو جاتا۔

لیکن ہر دیوانہ کی طرح، اگر تم محمدؐ کی اس ذہنی کیفیت کو نظر انداز کر کے دیکھو تو تم ان کو عقل و فہم کے لحاظ سے پختہ اور فکری اعتبار سے سلامت رو پاؤ گے۔"

گستاف لیبان کا یہ بھی خیال ہے کہ

"علمی نقطۂ نظر سے محمدؐ کو ان کی وارفتگیٔ مزاج کے باوجود سب سے بڑا بانی مذہب تسلیم کرنا ہوگا، ان کے مرض کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے، اس لئے کہ بانیانِ مذاہب میں تمام مفکرین صرف بارد مزاج والے ہی نہ تھے، پریشان دماغی سے دوچار ہونے والوں اور دیوانگی سے متاثر لوگوں نے بھی یہی کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے مذاہب کی بنیاد ڈالی، حکومتوں کا خاتمہ کیا، انسانی گروہوں میں جوش وولولہ پیدا کیا، اور انسانوں کی قیادت کی ہے، اگر اس دیوانگی کے بجائے دنیا پر عقل کو سیادت ملتی تو تاریخ انسانی کسی دوسری صورت میں ظاہر ہوتی۔[1]

کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مجذوب اور وارفتہ مزاج قرار دینا لیبان کا ایک بے سروپا دعویٰ نہیں ہے، نبوت سے پہلے یا اس کے بعد کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا، جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مجذوبیت کا اثر تھا، یا آپ عام انسانی خصائص سے الگ مزاج وطبیعت رکھتے تھے، یا کسی طرح کی نفسیاتی کجی سے دوچار تھے، اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو اس کا اثر اور رد عمل آپ کی زندگی کے مختلف حالات اور واقعات میں بھی ضرور نظر آتا۔

غار حرا میں پہلی وحی کے موقع پر، جب آپ نے کچھ خوف محسوس کیا تو اس وقت حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کیا کہا تھا؟ وہ تو آپ کی پوری شخصیت سے واقف تھیں۔ انھوں نے یہ کہا کہ

"آپ ہرگز پریشان نہ ہوں، اللہ آپ کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔

[1] دیکھئے لیبان کی کتاب حضارۃ العرب (عربی ترجمہ - زعیتر) ص ۱۴۵-۱۴۱ - ط بیروت سنہ ۱۳۹۹ھ

آپ رشتہ کا حق ادا کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ اٹھاتے، مفلس کی اعانت کرتے، مہمان کی خاطر کرتے اور حق پر آئی ہوئی مصیبتوں میں ہر ایک کا سہارا بنتے ہیں۔ (بخاری)

حضرت خدیجہؓ کے بیان سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انسانی کمال کی جو تصویر ابھرتی ہے اس کو ایسے جنون سے کیا نسبت ہے، جو .... عجیب و غریب کرتب دکھاتا ہو، اور ایسی حرکتوں کا باعث ہو جو ذوق سلیم پر گراں گذرتی ہوں۔[1]

لیبان کی رائے حقیقت دین سے بے خبری، اور تنقید علمی کے طریق استعمال سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، انسان اپنے اختیار سے جو حرکتیں کرتا ہے، امام غزالی نے ان کی تین قسمیں[2] بیان کی ہیں ان میں سے دو قسموں کا زیر بحث مسئلہ سے تعلق ہے، اور وہ یہ ہیں۔

فکری حرکت جو حق اور باطل سے تعلق رکھتی ہے۔

قولی حرکت جو صداقت اور دروغ سے تعلق رکھتی ہے۔

تینوں حرکتوں سے پیدا ہونے والی صفات حق، صداقت اور خیر جب کسی ایسے شخص میں پائی جائیں، جس کو اللہ نے آسمانی پیغام کے لیے چن لیا ہو، اور غور و فکر اور تحقیق و استقرا کے بعد، یہ بھی ثابت ہو جائے کہ ان کے برعکس باطل، دروغ اور شر کی صفات اس میں نہیں ہیں، ان تمام باتوں کی اس شخص کے سوانح اور تاریخی واقعات سے تواتر کے ساتھ تصدیق ہوتی ہو، تو ایسی صورت میں اس پر نزول وحی سے انکار کی کوئی وجہ نہیں، اس وحی کو باطنی الہام کہہ کر نظر انداز کرنا بھی درست نہ ہوگا۔

ایسے شخص کی نبوت کا انکار کرنے والے جب یہ کہتے ہیں کہ وہ حکما، مصلحین، قانون سازوں

---

[1] التہامی نقرہ - سیکولوجیۃ القصۃ فی القرآن۔ ص ۵۵ - ط تونس ۱۹۷۴ء [2] امام غزالی نے نبوت اور وحی کے بارے میں معروضی انداز میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے دیکھئے المنقذ من الضلال۔

اور حکومتوں کے بانیوں، سیاسی رہنماؤں اور اجتماعی لیڈروں کی صف اول میں شمار ہونے کے لائق ہے، تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ شاید جلد ہی اسے الٰہ قرار دے دیں گے، کیونکہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بالآخر الٰہ بنا ڈالا، یہ بلند صفات جن کا وہ تذکرہ کرتے ہیں کسی عبقری میں تو کبھی نہیں ہوئیں،

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ - (انعام - ۵۰)

آپ کہہ دیجئے کہ نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس خدا تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کو جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں میں تو صرف جو وحی میرے پاس آتی ہے اس کا اتباع کرتا ہوں۔

اگر کسی کو ڈاکٹر یا انجینیر ہونے کا دعویٰ ہو تو حقیقی صورت حال سے اس کے دعوی کی تصدیق یا تردید ہو جائے گی۔ رسول اللہ صلعم پر چودہ صدیوں میں قائدانہ صلاحیتوں کے جو مفکرین ایمان لائے ہیں، اور انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ دین کی جو پیروی کی، کیا وہ سب فریب خوردہ اور نادان تھے، کہ سچ اور جھوٹ اور حق و باطل میں تمیز نہ کر سکے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ذریعہ سے جو بنیادی انقلاب آیا اس کی اطمینان بخش توجیہ کے لیے تنہا علم کافی نہیں ہے، اس کے لیے ایمان کی روشنی درکار ہے کیونکہ اس انقلاب کے پس پردہ وہ وحی آسمانی ہے جس کا سلسلہ ۲۰ برس سے زیادہ عرصہ تک جاری رہا، اس دوران میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو وعدے کئے، غیب کی جو خبریں دیں وہ حرف بحرف پوری ہوئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی اور

وحی کی آمد پر آپ کو بوجھ اور تھکن کا جو احساس ہوتا تو دورِ جاہلیت کے مشرکین اسے جنون یا سحر کا نام دیتے، ان میں اور دورِ جدید کی اکاڈمیوں میں کام کرنے والے مستشرقین کے درمیان کیا فرق ہے، جب کہ یہ مستشرقین بھی نفسیاتی نقطۂ نظر یا عقلِ باطن کے حوالہ سے یا لیبان کے بقول دیوانگی کے لفظ سے وحی آسمانی کی ترجمانی کرتے ہیں، لیبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی کو بھی نہیں سمجھ سکا، اس کو وہ خواہش نفسانی کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور اس پر اس نے اپنے فاسد خیالات کی بنیاد رکھی ہے۔

وہ قرآن مجید کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبقریت کی دلیل مانتا، اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تصنیف قرار دیتا ہے، لیکن وہ قرآن مجید کو ہندوں کی مذہبی کتابوں سے فروتر سمجھتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ

> "قرآن مجید کا عمومی اندازِ بیان اور اس کے طفلانہ لاہوتی بیانات آسمانی مذاہب کا خاصہ ہیں، مگر ان کو ہندوں کے فکر و فلسفہ پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔"[۱]

وہ قرآن مجید کی جامعیت و کمال کا بھی منکر ہے، اس کا خیال ہے کہ قرآن کی افادیت محدود اور وقتی تھی، بعد کی صدیوں میں وہ انسانی ضرورتوں کی تکمیل سے قاصر رہا، وہ قرآن مجید کو مسلمانوں کی پسماندگی کا سبب قرار دیتا ہے۔[۲]

(باقی)

---

[۱] حضارۃ العرب۔ ص ۲۰۶۔ [۲] ایضاً۔ ص ۲۰۸۔ ۲۲۳۔

سیرۃ النبیؐ جلد سوم

پر

ایک نظر

از ضیاء الدین اصلاحی

(۳)

شکوک و شبہات کا جواب شکوک و اعتراضات کا جواب سیرۃ النبیؐ کا بنیادی مقصد ہے، چنانچہ اس کی تمام جلدوں میں بحث و جدال اور مناظرانہ انداز اختیار کئے بغیر غلط خیالات و نظریات کی تردید و تصحیح کی گئی ہے، سیرت کی اس جلد میں بھی اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں، اوپر اس کی بعض مثالیں گزر چکی ہیں، ابھی مسئلہ اسباب و علل کے بارہ میں بھی دو باطل اور افراط و تفریط پر مبنی نظریے کی مفصل تردید گذری ہے، ذیل میں چند اور بحثوں کی جانب بھی توجہ دلائی جاتی ہے۔

کفار کے اس بار بار کے اصرار سے کہ پیغمبر صلعم کو معجزہ کیوں نہیں دکھاتے، بعض نادان یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا، اگر وہ معجزہ دیکھ چکے ہوتے تو بار بار اس کے لیے اصرار کیوں کرتے؟ مولانا سید سلیمان ندویؒ اس استدلال کو سرتاپا غلط ثابت کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ کفار کو نفس معجزہ مانگنے پر نہیں بلکہ مادی اور ظاہری معجزات طلب کرنے پر تنبیہ کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ نشانیوں کے ظاہر ہونے کے بعد بھی یہ عناد سے طلب معجزہ پر مصر ہیں، چنانچہ ان تمام مقامات میں جہاں کفار کی اس طلب معجزہ کا ذکر ہے یہ تصریح موجود ہے، اور انھیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ان

خوارق سے انھیں تسلی نہ ہوگی، ان کو چاہئے کہ نبوت کے اصلی آثار و علامات کی جانب توجہ کریں کہ سعادت مند دلوں کی تسلی ان ہی سے ممکن ہے، اس سلسلہ میں وہ بعض قرآنی آیتوں کا حوالہ دیتے ہیں، جن میں کفار کے معجزہ طلب کرنے کے جواب میں اللہ تعالےٰ نے نبوت کے اصلی آثار و علامات کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی ہے، اور بتایا ہے کہ ہم نشانیاں کھول کر بتا چکے ہیں، لیکن ان نشانیوں سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو اہل یقین ہیں، اور جو ہر امر میں شک کرتے ہیں، ان کا علاج صرف دوزخ ہے، (بقرہ - ۱۴) ایک اور جگہ معجزات کی طلب پر گذشتہ قوموں کے واقعات کا جو اگلی کتابوں میں مذکور ہیں، حوالہ دیا گیا ہے کہ دیکھ لو ان کا کیا حشر ہوا جنھوں نے معجزوں کو دیکھکر بھی ایمان قبول نہیں کیا (طہٰ - ۸) (ص ۲۳۴ و ۲۳۵) وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ معجزات ایک وقتی چیز ہیں جو دنیا کے دوسرے حوادث کی طرح فنا ہو جاتے ہیں، اس بنا پر اگر ہر معاند کے سوال پر پیغمبر معجزہ ہی دکھاتا رہے تو یہ تسلسل شاید کبھی ختم نہ ہو اور پیغمبر کی زندگی صرف ایک تماشا گر کی حیثیت اختیار کر لے، اس لیے ظاہری معجزہ طلب کرنے والوں کو دائمی اور مسلسل معجزہ کی طرف ملتفت ہونے کی تاکید ہوتی ہے۔ (ص ۲۳۶)

پھر سید صاحبؒ ثابت کرتے ہیں کہ معاندین معجزات کے ظہور کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے، انھیں یہ یقین ہوتا ہے کہ ہماری طرح کا ایک مدعی انسان کبھی معجزہ دکھانے پر قادر نہیں ہو سکتا، اس لئے وہ کوئی خارق عادت امر پیش نہ کرے گا۔ اس طرح اس کی سبکی اور رسوائی عالم آشکارا ہو جائے گی، لیکن قدرت الٰہی آخری حجت کے طور پر ان کے سامنے معجزات اور خوارق عادت بھی پیش کر دیتی ہے، تاہم ان کو دیکھ کر بھی معاندانہ روح ان کے دلوں میں پیغمبروں کی سچائی کا اعتبار نہیں پیدا ہونے دیتی اور وہ اسے خدائی قدرت کا کرشمہ سمجھنے کے بجائے شیطانی عمل اور سحر و جادو قرار دیتے ہیں، حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو متعدد معجزے دکھائے مگر ہر ایک کے جواب میں انھیں یہی سننا پڑا کہ تم جادوگر ہو، حضرت موسیٰؑ کے معجزۂ عصا کو دیکھکر مصر کے جادوگر سجدے میں گر گئے، اور حضرت موسیٰؑ کی پیغمبری پر ایمان لے آئے، مگر فرعون یہی کہتا رہا: "یہ موسیٰؑ تم سب کا بڑا جادوگر ہے، جس نے تم کو جادو سکھایا" (ص ۲۳۸)

انجیل کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے سب سے زیادہ معجزات دکھائے لیکن ہر معجزہ کے وقت دو جماعتیں ہو جاتی تھیں ایک معتقدین کی جو یقین کرتی تھی کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور دوسری کہتی تھی کہ یسوع کے ساتھ شیطان رہتا ہے، انھوں نے متعدد دفعہ لوگوں سے کہا کہ تم معجزات دیکھتے ہو مگر ایمان نہیں لاتے۔ (ص ۲۳۸)

کفار قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزوں کے طالب ہوتے تھے مگر جب معجزے دیکھتے تھے تو کاہن اور جادوگر کہتے تھے، غرض معاندین بڑی سے بڑی نشانی دیکھکر بھی شک و شبہہ کے گرداب سے نہیں نکلتے تھے، اور معجزات کے ظہور کے بعد بھی ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی تھی (ص ۲۳۹، ۲۴۰)

غرض کفار و معاندین کے اس اصرار سے کہ پیغمبر ہمکو معجزہ کیوں نہیں دکھاتے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پیغمبر اسلامؐ نے ان کو سرے سے کوئی معجزہ ہی نہیں دکھایا، تمام انبیاءؑ کی سیرتیں شہادت دیتی ہیں کہ ان سے معجزات صادر ہونے کے بعد بھی معاندین اپنے انکار و اعراض پر نہایت استقلال کے ساتھ قائم رہے، اور ان کا انکار ایمان سے مبدل نہ ہوا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے معاندین کو بھی نشانیاں دکھائی جاتی تھیں، مگر انھیں عناد کی کورباطنی کے باعث ان سے تسکین نہیں ہوتی تھی، چنانچہ کفار قریش کے حال میں قرآن مجید کا بیان ہے۔

"ان کے پاس خدا کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی نہیں آتی، لیکن وہ اس سے اعراض کرتے ہیں، حق ان کے پاس آیا تو انھوں نے اس کو جھٹلایا تو عنقریب جس چیز کا مذاق اڑاتے ہیں، اس کی حقیقت ان کو معلوم ہو جائے گی، (انعام - ۱) ص ۲۴۰، ۲۵۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزے نہ دینے کے متعلق شکوک اور اس میں تاخیر کے اسباب ہم پہلے قلمبند کر چکے ہیں،

معجزۂ شق القمر کے متعلق پہلے سید صاحب نے قدیم اعتراض و جواب کو نقل کیا ہے۔ (ص ۵۶۳ تا ۵۶۶) اور آخر میں خود اس کے بارہ میں اعتراض کا یہ جواب تحریر کیا ہے۔

"شق القمر اہل مکہ کی طلب پر ایک آیت الٰہی تھی یعنی ان منکروں کو ان کی خواہش کے مطابق ایک نشانی دکھائی گئی تھی، احادیث میں یہ ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا' خواہ در اصل چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں، یا خدا نے ان کی آنکھوں میں ایسا تصرف کر دیا ہو کہ ان کو چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا، جو خدا انسانوں کی آنکھوں میں خلاف عادت تصرف کر سکتا ہے، وہ خود چاند میں بھی خلاف عادت تصرف کر سکتا ہے، پھر چونکہ اللہ نے یہ نشانی اہل مکہ کے لیے ظاہر کی تھی، اور ان ہی کے لیے یہ آیۂ ثبوت تھی، اس لئے تمام دنیا میں اس کے ظہور اور رویت کی حاجت نہ تھی، اس بنا پر بالفرض اگر دنیا کے دوسرے حصوں میں شق قمر مشاہدہ نہ ہوا تو یہ حیرت اور تعجب کی بات نہیں، بلکہ اہل مکہ کے علاوہ اور لوگوں کو دوسرے شہروں اور ملکوں میں اس کا نظر نہ آنا ہی مصلحت الٰہی تھی کہ اگر یہ عام طور سے دوسرے اقطاع عالم کے لوگوں کو بھی نظر آتا تو یہ سمجھا جا سکتا کہ یہ آسمان کے طبعی انقلابات میں سے کوئی انقلاب تھا، جیسا کہ اور سیکڑوں قسم کے تغیرات اس سے پہلے ہو چکے ہیں، جیسا کہ فلکیات اور علم بدء الخلق میں مذکور ہیں، لیکن جب اہل مکہ کے علاوہ جو شہر مکہ میں تھے، یا باہر قافلہ میں تھے، صرف ان ہی کو نظر آیا، تو اس بات کی صاف اور صریح دلیل ہے کہ یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک نشان کے طور پر ظاہر ہوا و للہ الحمد" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ ص ۵۶۶ تا ۵۶۷)

تحقیق و تدقیق و جستجو تلاش و تحقیق اور بحث و جستجو مولانا سید سلیمان ندویؒ کی بڑی اہم خصوصیت ہے، ان کی تمام تحریروں کی طرح یہ جلد بھی ان کی تلاش و محنت اور تحقیق و تدقیق کا شاہکار ہے اور یہ

جو کچھ عرض کیا گیا ہے، وہ ان کی عالمانہ و محققانہ شان کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہے تاہم یہاں ایک مستقل مسئلہ میں ان کی سعی و کاوش اور بحث و تحقیق کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے ظاہر ہوگا کہ وہ تلاش و جستجو اور بحث و تحقیق میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتے تھے،

سید صاحب نے معراج کی تاریخ کی تعیین اور اس کے عدم تعداد کے مسئلہ میں بڑی محققانہ بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ صحیح اور مستند او معتبر کے روایات کے مطابق اور جمہور علما کی رائے کے موافق معراج صرف ایک دفعہ واقع ہوئی، جو لوگ تعدد کے قائل ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ چونکہ روایتوں میں جزئیات معراج کے بیان میں اختلاف ہے، اس لئے انھوں نے رفع اختلاف کے لیے متعدد دفعہ معراج کا وقوع تسلیم کیا ہے[1]، تاکہ ہر مختلف فیہ واقعہ ایک ایک جداگانہ معراج پر منطبق کیا جائے، لیکن در حقیقت یہ ایک فرض محض ہے، جس کو واقعیت سے کوئی تعلق نہیں، مستند اور صحیح روایات ہمارے سامنے ہیں، اور ان میں تعدد معراج کا اشارہ تک نہیں ہے، ایک ایسے اہم مافوق بشری مشاہدہ اور طویل واقعہ کے متعلق جو اس وقت واقع ہوا جب مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور جس قدر تھی وہ بھی پراگندہ حال اور منتشر الخیال تھی، اور ایک ایسے واقعہ کے متعلق جس کے رواۃ اکثر وہ لوگ ہیں جو اس وقت پیدا نہیں ہوئے تھے یا بہت چھوٹے تھے، یا مدنی لوگ ہیں، جن کو ہجرت سے قبل کے واقعات کی ذاتی اور بلاواسطہ واقفیت نہ تھی اگر جزئیات میں معمولی اختلاف یا بعض واقعات کی ترتیب میں تقدم و تاخر واقع ہوا ہے تو ان کی تطبیق کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں، خود ہمارے سامنے روزانہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں، ان کے جزئیات کی تفصیل اگر مختلف راویوں سے سنیں یا مختلف اوقات میں ہم خود بیان کریں تو ترتیب واقعات اور دیگر جزئی امور میں بیسیوں اختلافات پیدا ہو جائیں گے

---

[1] امام سہیلی نے روض الانف شرح سیرۃ ابن ہشام میں اسی استدلال کی بنا پر تعدد کا میلان ظاہر کیا ہے (جلد اول مصر، ص ۲۴۴)

باایں ہمہ اصل معاملہ اور اس کے اہم اجزا کے وقوع میں شک و شبہہ نہ ہوگا۔

بعض ارباب سیر نے دو دفعہ معراج کا ہونا ثابت کیا ہے، وہ ایک کو اسرا اور دوسرے کو معراج کہتے ہیں کہ قرآن میں اسرار اور احادیث میں معراج کا نام آیا ہے، انھوں نے اس کی ضرورت اس لئے سمجھی کہ قرآن کے پندرھویں پارہ میں اسرار کا جو بیان ہے اس میں صرف مکہ سے بیت المقدس تک کا سفر مذکور ہے، اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جسم کے ساتھ حالت بیداری میں ہوا حالانکہ معراج میں تو آسمان تک کا سفر ہوا ہے، اور عجیب و غریب واقعات پیش آئے ہیں اور بعض روایتوں میں یہ تصریح ہے کہ یہ خواب تھا، بہرحال یہ بھی استنباط اور قیاس سے آگے نہیں بڑھتا، قرآن مجید کے الفاظ خواب و بیداری دونوں کے متحمل ہیں، اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں کہ معراج ایک ہی دفعہ واقع ہوئی ہے، علامہ زرقانی نے تصریح کی ہے کہ "یہی جمہور محدثین متکلمین اور فقہا کی رائے ہے، اور روایات صحیحہ کا تواتر بھی بظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے اور اس سے عدول نہیں کرنا چاہئے، حافظ ابن کثیر نے تعدد معراج کے قول کو بالکل لغو اور بے سند اور خلاف سیاق احادیث ٹھرایا ہے، (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ ص ۳۹۶ و ۳۹۷)

معراج کے تعدد کی تردید اور اس کے ایک ہی دفعہ واقع ہونے کی تحقیق و صراحت کرنے کے بعد وہ اس کے وقت اور زمانہ کی تعیین کی جانب متوجہ ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں فرماتے ہیں۔ کہ معراج کے وقت اور زمانہ کی تعیین میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ جب کہ تاریخ اور سنہ کی تدوین نہیں ہوئی تھی، اور عرب میں عموماً اسلام سے پہلے کسی سنہ کا رواج نہ تھا تاہم وقت کے متعلق اتنا تو یقینی طور پر معلوم ہے کہ رات کا وقت تھا، خود قرآن مجید میں ہے، اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا (یعنی لے گیا اللہ تعالےٰ اپنے بندے کو رات کے وقت) اور تمام روایات بھی اس پر متفق اللفظ ہیں لیکن صحیح دن اور تاریخ کا پتہ لگانا نہایت مشکل ہے، محدثین کے یہاں کسی سے بھی

بروایت صحیحہ اس کی تصریح موجود نہیں ہے، ارباب سیر نے بعض صحابہ، تابعین اور تبع تابعین سے کچھ روایتیں کی ہیں، لیکن ان کی تصریحات مختلف ہیں تاہم اتنی بات پر بلا اختلاف سب کا اتفاق ہے کہ یہ بعثت اور آغاز وحی کے بعد اور ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے جو مکہ معظمہ میں پیش آیا، اس کے بعد سید صاحب ماہ و سال کے متعلق ارباب سیر کے مختلف اقوال پوری تلاش و جستجو سے نقل کر کے ان پر نقد و تبصرہ اور محاکمہ کرتے ہیں، اور آخر میں اپنا محقق اور مرجح فیصلہ یہ سناتے ہیں۔

قدیم راویوں کا بڑا حصہ ایک سال قبل ہجرت کا زمانہ متعین کرتا ہے، ایک دو بزرگ چند مہینے کی مدت اور بڑھا دیتے ہیں، متاخرین میں سے بعض اصحاب نے جو قیاس تاریخی سے تین سال یا پانچ سال قبل ہجرت کا زمانہ متعین کرنا چاہا ہے، اس کا مبنی یہ ہے کہ بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ خدیجہؓ نماز پنجگانہ کی فرضیت سے پہلے وفات پاچکی تھیں، نماز پنجگانہ بالاتفاق معراج میں فرض ہوئی، پھر بخاری ہی میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے ہجرت سے تین سال پہلے وفات پائی اور دوسرے راویوں نے بیان کیا ہے کہ ہجرت سے پانچ سال پہلے انتقال کیا، ان مقدمات کو یکجا کر کے انھوں نے یہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے تین سال پہلے (بقول ابن اثیر)، یا پانچ سال پہلے (بقول قاضی عیاض وغیرہ) پیش آیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ استدلال اس وقت درست ہو سکتا تھا، جب یہ ثابت ہوتا کہ نماز پنجگانہ کی فرضیت اور حضرت خدیجہؓ کی وفات دونوں ایک ساتھ ہوئیں یا کم از کم یہ کہ پہلا واقعہ دوسرے واقعہ کے چند روز بعد پیش آیا، حضرت عائشہؓ کی روایت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے، کہ حضرت خدیجہؓ نے معراج (فرضیت نماز پنجگانہ) سے پہلے وفات پائی، اب یہ نہیں معلوم کہ ایک مہینہ پہلے یا سال بھر پہلے یا چند سال پہلے، اس لئے ان قیاسات سے معراج کی تاریخ متعین نہیں ہو سکتی۔

بہرحال ابتدائی راویوں کی کثیر جماعت جن میں بعض نہایت معتبر اور ثقہ ہیں اسی جانب ہے کہ

یہ ہجرت یعنی ربیع الاول سنہ ۱ھ سے ایک سال یا ڈیڑھ سال پہلے کا واقعہ ہے، امام بخاری نے جامع صحیح میں گو کوئی تاریخ نہیں بیان کی ہے، لیکن ترتیب میں وقائع قبل ہجرت کے سب سے آخر میں اور بیعت عقبہ اور ہجرت سے متصلاً پہلے واقعۂ معراج کو جگہ دی ہے، اور ابن سعد نے بھی سیرت میں واقعۂ معراج کا یہی موقع ترتیب میں رکھا ہے، اس سے حدیث اور سیرت کے ان دو اماموں کا یہی منشا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہجرت سے کچھ ہی زمانہ پہلے خواہ وہ ایک سال ہو یا اور کچھ کم و بیش معراج کا زمانہ متعین کرتے ہیں، ہمارے نزدیک قرآن مجید سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے کہ معراج اور ہجرت کے بیچ میں کوئی زمانہ حائل نہ تھا، بلکہ معراج درحقیقت ہجرت ہی کا اعلان تھا۔

مہینہ کی تعیین مشکل ہے، جو لوگ ہجرت یعنی ربیع الاول سنہ ۱ھ سے ایک سال پہلے کہتے ہیں ان کے حساب سے اگر یہ ربیع الاول ادھر شامل کرلیا جائے تو ادھر معراج کا ایک مہینہ ربیع الآخر پڑے گا، اور اگر شامل نہ کیا جائے تو ربیع الاول رہے گا، اور اگر عام و مشہور و معمول بہ رجب کی تاریخ اختیار کی جائے تو ہجرت سے ایک سال، ۸ مہینے پیشتر کا واقعہ تسلیم کرنا ہوگا۔ (ص ۲۰۲، ۲۰۳)

سید صاحب نے اس جلد میں کہیں کہیں الفاظ و لغات کی تشریح اور نحو و عربیت کے مسائل پر بھی گفتگو کی ہے، اس سے بھی تحقیق و تدقیق میں ان کی عظمت و بلند پائیگی ظاہر ہوتی ہے۔

اسرار و حکم کی وضاحت مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کتاب کے مباحث کی تعبیر و ترجمانی کے لیے حکیمانہ انداز اختیار کیا ہے، جس سے اکثر امور و مسائل کی غرض و غایت اور حکمت و مصلحت بھی واضح ہوگئی ہے، یہ پہلے گذر چکا ہے کہ قرآن مجید اسباب و علل کا قائل ہے، اور اس نے اشیاء کے خواص و طبائع، ان کے مصالح، ان کی پیدائش کی حکمتیں اور مخلوق الٰہی کے منافع کا ذکر بھی کیا ہے، جس پر سید صاحب نے مفصل بحث کی ہے، ذیل میں بعض احکام و مسائل کے مصالح

و علل بیان کئے ہیں، مصنف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شق صدر یا شرح صدر کے بیان میں لکھتے ہیں:

"جن آیتوں میں دیگر انبیاء علیہم السلام کو عطیۂ علم دئے جانے کا ذکر ہے ان میں اکثر میں "علم" کے ساتھ "حکم" کا لفظ بھی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاوہ خالص شرعی ضرورتوں کے نظم و حکومت اور فیصلۂ احکام کے لئے بے غور و فکر کے بدیہی صحیح اور حاضر علم کی ضرورت ہے، چونکہ معراج ہجرت کا اعلان اور اسلام کے مستقبل کا اعلان تھا جس کے بعد آنحضرتؐ کو حکم کی طاقت عطا کی جانے والی تھی، اس لیے شرح صدر کے عطیہ کے لیے یہی مناسب موقع تھا، علاوہ ازیں معراج کے حقائق و مناظر جو نفوس نبویہ کے ادراکات کی آخری سرحد ہیں، ان کے احاطہ کے لیے بھی شرح صدر کی ضرورت تھی۔ (صفحہ ۵۰۳ و ۵۰۴)

اس سے شرح صدر کی غرض و غایت اور حکمت و مصلحت واضح ہو جاتی ہے، ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"شرح صدر یعنی سینہ کا کھول دینا یا اس غرض سے چاک کرنا کہ وہ انوار الٰہی سے معمور کیا جائے، ایک دولت ربانی تھی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی، ارشاد ہوا: "اے محمد کیا ہم نے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا یا چاک نہیں کر دیا (الم نشرح-۱)" احادیث میں گو اس شرح صدر کی پوری تفصیل مذکور ہے، مگر بہرحال قرآن پاک سے اس کا ثبوت ملتا ہے، کہ خواہ یہ ظاہری طور سے یا باطنی رنگ میں علم و حکمت اور نور معرفت کی غیر معمولی اور مافوق بشری بخشش ہو، ہر صورت میں وہ ہم سے ایک بالاتر کیفیت تھی۔" (ص ۵۰۰)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص ذاتی کے بیان میں آپ کی کثرت ازدواج کے خاص وجوہ و مصالح یہ بتائے ہیں۔

"اصل یہ ہے کہ عرب میں نکاح کی تعداد متعین نہ تھی، بلکہ بنی اسرائیل میں بھی،

اس کی تحدید نہ تھی، توراۃ میں ایسے انبیاءؑ اور بزرگوں کے نام ملتے ہیں جن کی متعدد بلکہ سیکڑوں بیویاں تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے عہد شباب میں یعنی ۲۵ سے ۵۰ برس کی عمر تک صرف ایک بی بی پر کفایت کی، حضرت خدیجہؓ کے بعد ایک ساتھ دو نکاح کیے حضرت سودہؓ سے جو کبیر السن تھیں، اور حضرت عائشہؓ سے جو صرف ۹ برس کی تھیں، یہ اتنی چھوٹی لڑکی سے نکاح ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ صرف دو خاندانوں میں محبت اور یکجہتی کی ترقی ہی کے لئے ہو سکتا تھا، مدینہ آکر آپؐ نے کئی نکاح کئے، ان نکاحوں پر ایک عمیق نظر ڈالنے سے خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان میں دو قسم کی عورتیں تھیں، ایک وہ جو رؤسائے قبائل کی لڑکیاں تھیں اور جن سے نکاح کا مقصد اسلام کی بہتری کے لئے تعلقات کی توسیع اور اضافہ تھا، حضرت عائشہؓ صدیق اکبرؓ کی اور حضرت حفصہؓ فاروق اعظمؓ کی صاحبزادی تھیں، حضرت ام حبیبہؓ ابو سفیانؓ رئیس بنی امیہ کی بیٹی تھیں، حضرت جویریہؓ قبیلہ بنی المصطلق کی رئیسہ تھیں، حضرت صفیہؓ رئیس خیبر کی دختر تھیں، ازواج مطہرات میں دوسری وہ بیوہ عورتیں جن کا سن زیادہ تھا، اور گویا اس طرح ان کی کفالت کا بار آپؐ نے اٹھایا چنانچہ حضرت سودہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت زینبؓ ام المساکین یہ سب بیوائیں تھیں ایک اور بیوی حضرت زینبؓ بنت جحش تھیں جو گو بیوہ نہ تھیں لیکن مطلقہ تھیں ان کے شوہر نے ان کو طلاق دیدی تھی، اس تفصیل سے آپ کی کثرت ازدواج کے اسباب منکشف ہوئے ہوں گے۔" سیرۃ النبیؐ جلد سوم ص ۸۳۶ و ۸۳۷)

بحث و استدلال کی دلنشینی مولانا سید سلیمان ندویؒ کی بحث کا انداز سلجھا ہوا اور دلائل پیش کرنے کا طرز موثر اور دلنشین ہوتا ہے۔ گذشتہ صفحات میں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں، ان سے انکی بحث کی

خوبی، تاثیر اور دلنشینی پوری طرح ظاہر ہو چکی ہے، ذیل میں اس کی براہ راست چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

کتاب کا آغاز اس موثر اور دلنشین پیرایہ میں کیا ہے۔

"جس طرح ہماری مادی دنیا ایک نظام خاص پر چل رہی ہے، مثلاً رات کے بعد دن نمودار ہوتا ہے، خزاں کے بعد بہار آتی ہے، ستارے غروب ہوتے ہیں تو آفتاب نکلتا ہے گرمی جاتی ہے تو جاڑے آتے ہیں، پھول اپنے وقت پر کھلتے ہیں، درخت اپنے موسم میں پھلتے ہیں، ستارے اپنے معین اوقات پر ڈوبتے اور نکلتے ہیں، اسی طرح روحانی عالم بھی اپنا ایک خاص نظام رکھتا ہے، اس کا بھی ایک آسمان و زمین ہے، وہاں بھی تاریکی اور روشنی ہے، خزاں اور بہار ہے، فصل و موسم ہے۔

آسمانہاست در ولایت جاں کار فرمائے آسمان جہاں

جب روئے زمین پر گناہوں کی تاریکی اور بدیوں کی ظلمت محیط ہو جاتی ہے تو صبح کا تڑکا ہوتا ہے، آفتاب ہدایت نمودار ہوتا ہے، باغ عالم میں جب برائیوں کی خزاں چھا جاتی ہے، تو موسم بدلتا ہے، اور بہار نبوت رونق افزا ہوتی ہے۔" (ص ۱ و ۲)

ایک اور جگہ قرآن کے اعجاز کی اس موثر پیرایے اور دلنشین انداز میں وضاحت کی ہے۔

"قرآن مجید صرف فصاحت و بلاغت ہی کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اپنی تمام حیثیات کے لحاظ سے معجزہ کامل ہے، اس کے معجزہ کامل ہونے پر مختصر ترین دلیل یہ ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس گذرے کہ کوہ صفا کی چٹان پر کھڑے ہو کر ایک امی نے دنیا سے یہ غیر متزلزل تحدی کی کہ وہ اس کا جواب پیش کرے تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان تیرہ صدیوں کا ایک ایک سال گذر گیا مگر ایک آواز بھی اس تحدی کو قبول کرنے کے لئے بلند نہ ہوئی، اگر صرف فصاحت و بلاغت ہی کو معیار اعجاز

قرار دیا جائے تو کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ عین اس وقت جب ایک امی کی طرف سے جو ایک شعر تک موزوں نہیں پڑھ سکتا تھا (بخاری)، یہ مدعیانہ اعلان عرب میں شائع ہوا اس وقت عرب کے قبیلہ میں زبان آور شعرا اور آتش بیان خطباء موجود تھے، مگر اس "صورت سرمدی" کے سامنے سب کی زبانیں گنگ ہوگئیں، کفار عرب نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی تکذیب کی کیا کیا کوششیں نہ کیں، انھوں نے اس راہ میں جان و مال قربان کیا، دین و کیش کو برباد کیا، اپنے عزیزوں اور فرزندوں کو نثار کیا، خود اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھیں، ان کے سپاہیوں نے میدان جنگ میں پڑے جائے، ان کے دولتمندوں نے اپنے خزانے کھول دیئے، ان کے شاعروں اور خطیبوں نے اپنی آتش بیانیوں سے تمام ریگستان عرب کو تنور بنا دیا، یہ سب کچھ کیا مگر یہ نہ ہوسکا کہ قرآن مجید کی ایک سورہ کا جواب پیش کریں جو اسلام کے دعوائے حق و صداقت کے کنگرہ کو چشم زدن میں پست کر دیتا، کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کی مثال لانے سے عاجز تھے، اور جب وہ جو زبان کے اصل مالک اور محاورۂ عرب کے طبعی ماہر تھے، اس کے مقابلہ سے عاجز تھے، تو اس زمانہ کے بعد کے لوگوں کے لئے تو یہ عجز اور درماندگی اور زیادہ نمایاں ہے۔" (صفحہ ۵۲۲ و ۵۲۳)

علامات نبوت قبل بعثت کی بحث کی ابتدا اس دلآویز اور پراثر انداز میں ہے۔

"ہر شخص اس کو تسلیم کرے گا کہ ممتاز افراد کے سوانح زندگی میں شروع ہی سے ایسے آثار پائے جاتے ہیں جو ان کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کرتے ہیں، جب یہ ان عام ممتاز افراد انسانی کا حال ہے جو خاندانوں قوموں اور ملکوں کے صرف ظاہری رہنما اور رہبر ہوتے ہیں تو اس حیثیت سے ان برترہستیوں کی نسبت کیا شبہ

ہوسکتا ہے جو قوموں کے روحانی پیشوا اور انسانیت کے حقیقی رہبر اور رہنما ہوتے ہیں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی سوانح زندگی میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔" (ص ۹۹)

نفسیاتی توجیہ اور علمائے نفس کے اقوال

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بحث و استدلال کو دلکش اور دلنشین انداز میں پیش کرنے کے لئے مباحث و مسائل کی نفسیاتی توجیہ بھی کی ہے۔ اور تفہیم و وضاحت کے لئے سائیکالوجی اور علم النفس کے ماہرین کے اقوال بھی پیش کئے ہیں ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، ایک جگہ یقین معجزات کے اصول نفسی کی وضاحت کے بعد اس بحث کو اس طرح ختم کیا ہے،

"اس لئے ایمان و کفر اور یقین و شک کے وجوہ منطقی طرز استدلال سے نہیں بلکہ زیادہ تر نفسیاتی اصول و قواعد سے ماخوذ ہیں۔" (ص ۸۰)

"معاندین کو معجزہ سے بھی تسلی نہیں ہوتی" کے زیر عنوان وہ انسانی نفسیات کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہیں۔

"جب کسی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ اس کی کسی بات کو حسن ظن پر محمول نہیں کرتا، اور اس کو اس کی ہر شئی میں شر، خبث اور بدی نظر آتی ہے، جلی سے جلی اور واضح سے واضح برہان بھی اس کے دل کے ریب اور قلب کے شک کو دور نہیں کر سکتے، معاندین جو انبیاء کے مکارم اخلاق، حسن عمل، حسن تعلیم اور دیگر علمی و عملی تلقینات کو باور نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعووں کو بھی تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے اور ہر قسم کی دلیلوں کے سن لینے کے بعد بھی وہ اپنے لاعلاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے۔" (ص ۲۳۶)

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو بار بار معجزہ دکھایا مگر وہ ایمان نہ لایا، اس کے ثبوت میں

سورۂ زخرف کی ایک آیت نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہ حکایت حضرت موسیٰؑ کے قصہ کا ایک ٹکڑا ہے، جو زمانہ ماضی کا ایک واقعہ تھا جس کو تمام تر صیغۂ ماضی سے ادا ہونا چاہئے تھا، لیکن اس میں تین جگہ اللہ تعالیٰ نے مضارع کا صیغہ استعمال کیا ہے، اس سے مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ایک خاص نکتہ نکالا ہے، جس میں معاندین کی نفسی کیفیت بھی بیان کی ہے، لکھتے ہیں۔

"گو یہ واقعہ خاص فرعون موسیٰ کے ساتھ پیش آیا، مگر یہ اسی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر عہد کے فرعون اور ہر پیغمبر کے معاندین کی نفسی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ جب ان کے پیغمبر خدا کے احکام اور نشانیاں لے کر ان کے پاس جاتے ہیں تو وہ صدائے خندۂ تحقیر بلند کرتے ہیں... عہد محمدی کے فرعونوں اور معاندوں کی نفسی کیفیت بھی یہی تھی کہ ان کو نشانیاں دکھائی جاتی تھیں، مگر انھیں عناد کی کور باطنی کے باعث ان سے تسکین نہیں ہوتی تھی۔" (ص ۲۴۸ و ۲۴۹)

عالم رؤیا کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے علمائے نفسیات کا یہ نظریہ پیش کیا ہے۔

"اب جدید عہد ترقی میں سائیکالوجی اور نفسیات کے علماء کا مشہور و مقبول نظریہ یہ ہے کہ ہم عالم بیداری میں اپنے جن خیالات، جذبات اور ارادوں اور تمناؤں کو جان کر یا بے جانے کسی سبب سے دبا دیتے ہیں، عالم خواب میں جب ہمارے تعقل اور احساس کی جابرانہ حکومت ان سے اٹھ جاتی ہے تو ان کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے، اور وہ ہم کو خواب بن کر نظر آتے ہیں۔" (ص ۳۶۱)

غرض یہ جلد گوناگوں معلومات اور حقائق و دقائق سے پُر ہے۔ ایک مضمون میں ان سب کو سمیٹ لینا ممکن نہیں۔

کتاب خواں اور صاحبِ کتاب

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پھلواری شریف، پٹنہ

اس مضمون کا عنوان "ضرب کلیم" کی، کُل دو ہی اشعار پر مشتمل، اقبالؔ کی درج ذیل نظم "طالب علم" سے ماخوذ ہے، جس کا تجزیہ قرآن کی روشنی میں کیا جا رہا ہے۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں!
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں!

اقبالؔ کے کلام میں جہاں بہت سی قرآنی اصطلاحات ہیں وہاں کچھ اصطلاحات انھوں نے لفظ "صاحب" میں کسرۂ اضافت لگا کر بھی وضع کی ہیں جن میں قرآن اور حدیث کے لاتعداد ارشادات، احکامات اور تعلیمات کو انھوں نے سمو دیا، ایسے تو "صاحب" کے لغوی معنیٰ مالک لیا جاتا ہے اور "صاحبِ کتاب" سے وہ شخص مُراد لیا جائے گا جس پر اُس کتاب کا نزول ہوا ہو یا وہ جو اُس کتاب کا مصنف ہو، مگر اقبالؔ نے اسی اضافت سے ہر جگہ اسے مجازی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

اور ہر ایسی اصطلاح میں لفظ "صاحب" سے "پیرو" مُراد لیا ہے جیسے :۔

اک اُس کی پھونک دیتی ہے بربادِ پیر کو
لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحبِ یقیں!

(ضرب کلیم، محراب گل افغان کے افکار، ۱۱)

کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں　　جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام و رے،

(ضربِ کلیم۔ "سرود")

آہ وہ مردانِ حق، وہ عربی شہسوار　　حاملِ "خُلقِ عظیم"، صاحبِ "صدق و یقین"

(بالِ جبریل۔ مسجدِ قرطبہ)

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث　　مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے!

(بالِ جبریل "غزل ۱۰")

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے　　تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ مازاغ!

(ضربِ کلیم۔ "غزل ص ۴۴")

اقبالؔ اس نظم میں طالبِ علم سے مخاطب ہیں، اور یہ کہہ کر کہ تو "کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں"۔ انھوں نے، قرآن کی روشنی میں، علم کی مقصدیت اور افادیت پر ایک لمبی بحث چھیڑ دی ہے۔ پہلے شعر میں تو انھوں نے ترغیبِ عمل کے رجحانات اُجاگر کرنا چاہا ہے، مگر دوسرے شعر میں اسے صاحبِ کتاب سے وابستہ کر کے یہ نکتہ نکالا ہے کہ عمل عشق سے فروزاں ہوتا ہے، جس کا سرچشمہ قرآن اور حدیث ہے، جس کے پیرو ہونے ہی پر "صاحبِ کتاب" کے زمرہ میں شامل کیا جانا ممکن ہے۔ اقبالؔ کے اس عشق میں رچی اور بسی وہ مشعل ہے، جو راہِ حیات میں ہر سنگِ گراں کو ذرّۂ بے مقدار بنا کر ختم کر دیتی ہے۔

اقبالؔ اُن علوم کے مخالف نہیں تھے، جو دنیوی یا درسی کتابوں سے حاصل کیے جاتے ہیں کیونکہ "تسخیرِ کائنات" کا فریضہ انجام دینے کے لیے ان سے مستفیض ہونا بھی لازمی اور از بس ضروری ہے۔ وہ خود اپنے زمانے کی جو دُنیا میں، اعلیٰ ترین تعلیم ہو سکتی تھی حاصل کر چکے تھے، اور اُس وقت برصغیرِ ہند میں (جس میں اب ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور برما شامل ہے) ایسے لوگ

انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ یہ بات بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے اوائل سالوں کی ہے۔ "علومِ تازہ" کے حصول پر "ضربِ کلیم" کی نظم "محراب گل افغان کے افکار۔ ۹" میں فرماتے ہیں:

کھلے ہیں سب کے لیے غریبوں کے میخانے
علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں!
اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تیری
ترے بدن میں اگر سوزِ لا الٰہ نہیں!

اسی سوز کی تلقین اقبالؔ نے اپنے صاحبزادے جاویدؔ اقبال (جو حال تک پاکستان سپریم کورٹ کے جج تھے)، کو بھی کی تھی، جب وہ انگلینڈ میں زیرِ تعلیم تھے۔

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ　　ہے اس کی نہاد کافرانہ
سرچشمۂ زندگی ہوا خشک　　باقی ہے کہاں مئے شبانہ!
خالی اُن سے ہوا دبستاں　　تھی جن کی نگاہ تازیانہ!
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو　　ہے اُس کا مذاق عارفانہ
جوہر میں ہو لا الٰہ تو کیا خوف　　تعلیم ہو گو فرنگیانہ!
شاخِ گُل پر چہک ولیکن
کر اپنی خودی میں آشیانہ

(ضربِ کلیم۔ "جاوید سے (۱)")

اسے اتفاق کہا جائے یا سعادتِ ازلی کی یاوری و مساعدت کہ اقبال نے جتنا زیادہ مغربی افکار و خیالات کا مطالعہ کیا اُتنا ہی ان میں مغربی علوم سے پیدا شدہ تہذیب، تمدن اور ثقافت کے خلاف ایک ناقدانہ ردِ عمل ترقی پذیر ہوتا چلا گیا، انھوں نے اس

ردِ عمل کے طور پر ایک زندہ اور آئیڈیل سوسائٹی کی تعمیر کے لیے صرف اسلام اور اس کی تعلیمات کو بطور بنیاد عمل اپنے پیش نظر رکھا، کیونکہ قرآن ایک دستور حیات ہے، اور اسلام فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے،

علوم، خواہ مشرقی ہوں یا مغربی، اقبالؔ ہر طالب علم کے بدن میں لا الٰہ کا سوز دیکھنے کے متمنی تھے، چنانچہ مشرقی علوم کی درسگاہوں اور ان سے فارغ التحصیل طالب علموں سے بھی ان کی مایوسی کا یہی عالم اور یہی وجہ تھی۔

مکتبوں میں کہیں رعنائیِ افکار بھی ہے؟ خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے؟

یہ پیرانِ کلیسا و حرم! اے وائے مجبوری! صلہ ان کی کد و کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری!

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک! نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ!

اقبالؔ کا یہ کہنا کہ کتاب خواں ہونے کے باوجود اگر طالبِ علم "صاحبِ کتاب" نہ بن سکا تو اس کی وجہ اُن کے نزدیک صرف یہ ہے کہ وہ علم کے ڈانڈے عشق سے استوار نہ کر سکا جو سب سے بڑی قوت محرکہ ہے، اور اسی وجہ سے اُس طالب علم کی موجوں میں اضطراب مفقود ہے، کیونکہ جذبۂ عمل صرف جذبۂ عشق سے تقویت پاتا ہے، جو تخلیقی فعلیت کا محرک ہے، اجزائے عالم کی تخلیق سراسر عشق سے ہوتی ہے، اور وجہ آفرینش اور مقصد حیات انسانی عشق کے سوا کچھ نہیں، عشق بوالہوسی کا نام نہیں، اور نہ جیسا غالبؔ نے کہا "خلل ہے دماغ کا" یہ ایک وجدانی کیفیت ہے، جو روحانی مسرت اور کسی بلند مقصد کے حصول کے لیے اپنے کو وقف کر دینے کا نام ہے، جو علم عشق سے محکم نہیں، ویسے علم کو، اقبالؔ درج ذیل نظم میں "تخمینِ و ظن"..... اور ویسے طالبِ علم کو "بندۂ تخمین و ظن" اور "کرمِ کتابی" سے موسوم کرتے ہیں۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن!
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن!

بندۂ تخمین و ظن! کرمِ کتابی نہ بن!
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب!

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات!
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات!
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات!
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب!

عشق کے ہیں معجزات سلطنتِ فقر و دیں!
عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں!
عشق مکان و مکیں! عشق زمان و زمیں!
عشق سراپا یقین، اور یقین فتحِ باب!

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے اُمّ الکتاب!

(ضربِ کلیم۔ "علم و عشق")

اقبالؔ کے نزدیک علم جلالِ کائنات سے مرعوب رہتا ہے، جس کے اصول جبری ہیں، اور اس میں وجدانی، الہامی اور ارتقائی انکشافات اور اطلاعات کی گنجائش نہیں جب کہ عشق کی رسائی حد ادراک سے بھی پرے ہے۔

علم ترساں از جلالِ کائنات عشق غرق اندر جمالِ کائنات

علم را بر رفتہ و حاضر نظر — عشق گوید آنچہ می آید نگر
علم پیماں بستہ با آئین جبر — چارۂ او چیست غیر از جبر و صبر
عشق آزاد و غیور و ناصبور
در تماشائے وجود آمد جسور

اقبال نے قرآن و حدیث کی روشنی میں علم کا جو نظریہ قائم کیا اُس پر مزید روشنی درج ذیل نظم میں ڈالی گئی ہے۔

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم — کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک — دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم
چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی — نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم
وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم!

(ضربِ کلیم ۔ "علم اور دین")

ان اشعار کی رو سے جس علم کو خدا نے دل و نظر کا ندیم بنا کر تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم سے ہم کنار کر دیا ہو، وہی علم ہر زمانہ میں حق و باطل کی جنگ میں اپنے بتوں کا آپ ابراہیم رہا ہے، اور جو علم اُن سے محروم ہے، اُسے اقبال "علم کم بصری" قرار دیتے ہیں، زندگی اور علم کے تعلق کو اقبال نے اس طرح واضح کیا ہے۔

زندگی کچھ اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے — زندگی سوزِ جگر ہے، علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، لذت بھی ہے — ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ!
اہلِ دانش عام ہیں، کم یاب ہیں اہلِ نظر — کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ!

شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ!

(ضربِ کلیم "تربیت")

علم پر اقبال کے ان سارے نظریات سے یہ کلیہ سامنے آتا ہے کہ علم وہ ہے جسے خدا نے دل و نظر کا ندیم بنایا ہو، اور جو نتیجتاً بدن میں سوزِ لا اِلٰہ پیدا کرے، دوسرے الفاظ میں علم وہ ہے، جسے حاصل کرنے میں انسان میں شانِ فقر پیدا ہو۔ "شانِ فقر" اقبال کے یہاں ایک ایسی اصطلاح ہے جو "صاحبِ کتاب" کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہے، اقبال کے فکری نظام میں فقر کی بنیادی اہمیت ہے، یہ تزکیہ نفس یعنی تنزیہی کیفیت کے حصول کی متبادل اصطلاح ہے جو انفس و آفاق پر غلبہ اور تفوق حاصل کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہے، ایک صاحبِ فقر اپنی زندگی کا شعار "شَعَآئِرَ اللہِ" پر قائم کرتا، اور اپنی زندگی کی تصاویر میں "صِبْغَۃَ اللہِ" یعنی اللہ کا رنگ بھرتا ہے۔

"شَعَآئِرَ اللہِ" کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

اے ایمان لانے والو! خدا ترسی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللہِ (سورۃ المآئدۃ ۔ ۵)

بتوں کی زندگی سے بچو، جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو، یکسو ہو کر اللہ کے بندے بنو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا۔ اب یا تو اُسے پرندے اُچک لے جائیں گے یا ہوا اُس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی، جہاں اُس کے پرخچے اُڑ جائیں گے۔

یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو) اور اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ

دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ (وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ) —— (سورۃ الحج ۲۲۔ رکوع ۴)

اقبالؔ جب طالب علم سے یہ کہتے ہیں کہ باوجود کرم کتابی بننے کے تو "صاحبِ کتاب" نہ بن سکا تو وہ یہی کچھ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام نہیں کرتا جو دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ اور اسی لیے تیرے بدن میں سوزِ لاالٰہ نہیں اور نہ تیرے فکر و عمل کی موجوں میں کوئی اضطراب ہے۔ ان ہی باتوں کو اقبالؔ نے اس طرح بھی نظم کیا ہے۔

زشت روئی سے تری، آئینہ ہے رسوا ترا
اور ہے تیرا شعار، آئینِ ملت اور ہے

(بانگِ درا۔ شمع اور شاعر، شمع)

"صاحبِ کتاب" صرف یہی نہیں کہ وہ اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرتا ہے، بلکہ وہ اپنی زندگی کی تصویر میں اللہ کا رنگ بھرتا ہے، یعنی وہ اللہ کے سارے صفات اپنا لیتا ہے، کیونکہ خدا خود فرماتا ہے۔

"(اے نبیؐ) کہو۔۔ اللہ کا رنگ اختیار کرو (صِبْغَةَ اللّٰهِ) اُس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟ اور ہم اُسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں"۔ (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۱۶)

جب صاحبِ کتاب اپنے مجسمہ کے خد و خال میں اللہ کا رنگ بھر لیتا ہے، تو وہ خدا کے اتنے قریب ہو جاتا ہے، کہ شاہد و مشہود کا فرق اور امتیاز مٹ جاتا ہے، اسے دیکھ کر لوگوں کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اللہ کا رنگ زیادہ گہرا ہے "یا صاحبِ کتاب" کا۔

میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے عشق
دیکھے مجھے، کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

(بانگِ درا۔ غزلیات حصہ اول)

"شَعَآئِرَ اللّٰهِ" اور "صِبْغَةَ اللّٰهِ" سے دراصل "حُبًّا لِّلّٰهِ" مراد ہے۔

"ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ)" (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۲۰)

چونکہ خدا انسان کی گرفت میں نہیں آسکتا اور انسان کسی انسان ہی کے قول کو سن کر اور فعل کو دیکھ کر ان پر عمل کرتا ہے، اور جس رنگ میں وہ رنگا ہے اسی رنگ میں اپنے کو رنگتا ہے۔ اس لئے خدا نے "حُبًّا لِّلّٰهِ" کا رُخ اس برگزیدہ نبیؐ کی طرف موڑ دیا کیونکہ وہ مجسم قرآن تھے اور حضورؐ کی ذاتِ اقدس قرآن کی عملی تصویر اور تفسیر ہے۔

"اے نبیؐ، لوگوں سے کہہ دو کہ "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمہاری خطاؤں سے در گذر فرمائے گا۔" ان سے کہو کہ "اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے، جو اس کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔ (سورۃ آل عمران ۳۔ رکوع ۴)

فقر کی اصطلاح درجِ ذیل آیات کا ترجمان ہے، جس سے گزر کر ہی ایک انسان "شعائر اللہ" کا احترام کرتا ہے، اور خود میں "صِبْغَةَ اللّٰهِ" بھرتا ہے۔

"قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۭ (فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی)" (سورۃ الاعلیٰ ۸۷۔ رکوع ۱)

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۔ (یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا) (سورۃ الشمس ۹۱۔ رکوع ۱)

فقر کے ان ہی راہوں پر چل کر جب "صاحبِ کتاب" شعائر اللہ اختیار کر لیتا ہے تو اس پر اسرارِ جہانگیری کھلتے ہیں، اور اس کی مٹی میں خاصیت اکسیری پیدا ہوتی ہے، اور یہی میراثِ مسلمانی اور سرمایۂ شبیری ہے، جس کے سامنے فغفوری تک جھکتی ہے۔

کے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے — وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی

(ضربِ کلیم۔ "سلطانی")

اقبالؔ کے نزدیک ہر علم کا اپنی جگہ پر مقام ہے، مگر وہ فقر پر اولیت حاصل نہیں کرسکتا، دونوں کا دائرۂ کار الگ الگ ہے، مگر ایک باشعور انسان اِن دونوں کے حسین امتزاج سے حد ادراک کی اُس منزل کو طے کرلیتا ہے، جہاں فرشتوں کے بھی پر جلنے لگتے ہیں۔ اقبالؔ کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہر طالب علم عشق اور علم کی صحیح طریقے پر تربیت و تزئین کرکے اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچائے کیونکہ یہی مقصودِ فطرت ہے، اور یہی رمزِ مسلمانی۔ ان دونوں کے دائرۂ کار پر اقبالؔ نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ — فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد — فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ
علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم — علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر — فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ
علم کا "موجود" اور، فقر کا موجود اور
اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰہ، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰہ (بالِ جبریل۔ غزل ۵۹)

الغرض اقبالؔ کے نقطۂ نظر سے جب انسان کی خودی عشق سے صیقل ہوکر فقر کے لبادہ میں جلوہ گر ہوتی ہے، یعنی جب وہ سچے دل سے اتباعِ شریعت کرنے لگتا ہے تو وہ "صاحبِ کتاب" ہوجاتی ہے، جو خالص قرآنی تصور ہے، ایسا انسان داعیِ اسلامؐ کے اخلاقِ حسنہ کا مقلد اور گفتار و کردار میں اللہ کی بُرہان ہوجاتا ہے، اور اس کے مزاج میں "قہاری و غفاری و قدوسی، و جبروت" کے چاروں عناصر ایک حسین تناسب سے جاگزیں ہوجاتے ہیں، اس مجسمہ کی تصویر تو سارا قرآن اور حضورؐ کی

ذاتِ اقدسؐ ہے، مگر نظم "طالب علم" اور اس مضمون کے عنوان کا چونکہ تجزیہ قرآن کی روشنی کیا جارہا ہے، اس لیے دونوں کی مناسبت سے ذیل میں چند ایسی آیات درج کی جارہی ہیں۔ جو صاحبِ کتاب "کے مجسمہ کا اجمالی خاکہ پیش کرتی ہیں۔

"الف، لام، میم، یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے، اُن پرہیزگار لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، (ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ)۔ نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے، اُس میں سے خرچ کرتے ہیں، جو کتاب تم (محمدؐ) پر نازل کی گئی ہے، (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں، اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں، اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۱)

حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال اگر انھیں چھو بھی جاتا ہے تو فوراً چوکنے ہوجاتے ہیں، اور پھر اُنھیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لیے "صحیح طریقہ" کار کیا ہے۔" (سورۃ الاعراف، رکوع ۲۴)

ہماری آیات پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنھیں یہ آیات سُنا کر جب نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں، اور اپنے رب کے حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے، اُن کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انھیں دیا ہے، اُس میں خرچ کرتے ہیں پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کے جزا میں ان کے لیے چھپا رکھا گیا ہے، اُس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے، بھلا کہیں یہ ہوسکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو وہ اُس شخص کی طرح ہوجائے، جو فاسق ہو؟" (سورۃ السجدہ ۳۲۔ رکوع ۲)

"بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے (محمدؐ کے) رب کی اس کتاب (قرآن)
کو جو اُس نے تم پر نازل کی ہے، حق جانتا ہے، اور وہ شخص جو اس حقیقت کی طرف سے
اندھا ہے، دونوں یکساں ہو جائیں؟ نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں
اور ان کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں، اسے مضبوط
باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے۔ ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو
برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انھیں برقرار رکھتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں، اور
اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بُری طرح حساب نہ لیا جائے۔ اُن کا حال
یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے
دیے ہوئے رزق سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں، اور بُرائی کو بھلائی سے دفع کرتے
ہیں۔ (سورۃ الرعد ۱۳ - رکوع ۳۔)

"سچے اہلِ ایمان تو وہ لوگ ہیں، جن کا دل اللہ کا ذکر سُن کر لرز جاتا ہے اور
جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے، اور وہ
اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے
(ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں، اُن کے لیے ان کے رب
کے پاس بڑے درجے ہیں، قصوروں سے درگزر ہے، اور بہترین رزق ہے۔ (سورۃ الانفال ۸ رکوع ۱)

یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کرے.....
وہ (خدا) اس کا حقدار ہے، کہ اس سے تقویٰ کیا جائے، اور وہ اس کا اہل ہو کہ (تقویٰ
کرنے والوں کو) بخش دے۔" ـــــ (سورۃ المدثر ۷۴ - رکوع ۲)

یہ (قرآن) ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے، اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ

اختیار کرلے۔" ـ (سورۃ الدھر ۷۶ - رکوع ۲)

"جو شخص ڈرتا ہے، وہ نصیحت قبول کرلے گا، اور اُس سے گریز کرے گا وہ انتہائی
بدبخت جو بڑی آگ میں جائے گا۔ پھر اس میں مرے گا نہ جئے گا۔" (سورۃ الاعلیٰ ۸۷ - رکوع ۱)

"(پس آج یہ رحمت) اُن لوگوں کا حصہ ہے، جو اس پیغمبر نبیٔ اُمّی (صلی اللہ علیہ وسلم)
کی پیروی اختیار کریں، جس کا ذکر انھیں اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔
وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال کرتا ہے۔
اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے بوجھ اُتارتا ہے، جو ان پر لدے ہوئے
تھے، اور وہ بندشیں کھولتا ہے، جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے، لہٰذا جو لوگ اُس پر ایمان
لائیں، اور اُس کی حمایت اور نُصرت کریں اور اُس روشنی (قرآن) کی پیروی اختیار کریں
جو اُس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔" (سورۃ الاعراف ۷ - رکوع ۱۹)

"اور اے پیغمبرؐ، جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں اور (اس کے مطابق) اپنے عمل
درست کرلیں، انھیں خوشخبری دے دو کہ اُن کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں
بہتی ہوں گی۔" (سورۃ البقرہ ۲ - رکوع ۳)

"طٰهٰ، ہم نے یہ قرآن تم (محمدؐ) پر اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں
پڑ جاؤ، یہ تو ایک یاد دہانی ہے، ہر اُس شخص کے لیے جو ڈرے۔" (سورۃ طٰهٰ ۲۰ - رکوع ۱)

"لوگو، تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس دلیلِ روشن آگئی ہے، اور ہم نے
تمھاری طرف ایسی روشنی (قرآن) بھیجی ہے، جو تمھیں صاف صاف راستہ دکھانے والی
ہے، اب جو لوگ اللہ کی بات مان لیں گے، اور اُس کی پناہ ڈھونڈیں گے اُن کو اللہ
اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے دامن میں لے لے گا، اور اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ

اُن کو دکھادے گا۔" (سورۃ النساء ۴ - رکوع ۲۰)

یہ تھا "صاحبِ کتاب" کا اجمالی خاکہ جن کے بدن میں سوزِ لا الٰہ اور جن کے فقر میں ارجِ قرآنی بے پردہ ہے۔ اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیں جن کے متعلق ارشادِ ربانی ہے ۔

"وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا (اور نامراد ہوا، وہ جس نے اس کو دبا دیا یعنی جس نے نفس کا تزکیہ کرنے اور اُسے بُرائیوں سے پاک کرنے کی بجائے اپنے نفس کے برے رجحانات کو اُبھار کر اچھے رجحانات کو دبادیا۔" (سورۃ الشمس ۹۱ - رکوع ۱)

ایسے ہی لوگوں کو اقبال "صاحبِ کتاب نہیں" سے موسوم کرتے ہیں، جو ترجمان ہے درج ذیل آیات کا۔

"ہم (خدا) اُن کا اپنا ہی ذکر اُن کے پاس لائے ہیں، اور وہ اپنے ذکر سے منہ موڑتے ہیں۔" (سورۃ المومنون - ۲۳ - رکوع ۴)

"لوگو، ہم نے تمھاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے، جس میں تمھارا ہی ذکر ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔؟" (سورۃ الانبیاء - ۲۱ - رکوع ۱)

"پس اے نبیؐ، جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے، اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے، اُسے اس کے حال پر چھوڑ دو ـــــ ان لوگوں کا مبلغ علم بس یہی کچھ ہے۔ (سورۃ النجم - ۵۳ - کورع ۲)

"جو شخص رحمان کے ذکر سے تغافل برتتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلّط کر دیتے ہیں، اور وہ اپنی جگہ پر سمجھتے ہیں، کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔ (سورۃ الزخرف ۴۳ - رکوع ۴)

"اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (دنیا حاصل کرنے کے دُھن کی روش کے انجام کو) جانتے ہوتے تو تمھارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا۔ (کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ)۔ (سورۃ التکاثر ۱۰۲ رکوع ۱)

"ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے

تو شفا اور رحمت ہے، مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔" (سورۃ - بنی اسرائیل ۱۷ - رکوع ۹)

"اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اُتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے۔ اور پھٹا پڑتا ہے، یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنی حالت پر غور کریں۔" (سورۃ الحشر ۵۹ - رکوع ۳)

"یہ (قرآن) ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے، پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم اعتنائی برتتے ہو۔ اور اس نعمت میں اپنا حصّہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو۔

(سورۃ الواقعہ - ۵۶ - رکوع ۳)

الغرض اقبال اس مختصر سی نظم میں طالبِ علم کو اپنے دماغ (علم، عقل) کے ساتھ دل کو بھی عشق سے روشن کرنے کی تلقین کرتے ہیں، کیونکہ جب تک علم کے ساتھ عشق بھی کارفرما نہ ہو مقصدِ حیات پورا نہیں ہو سکتا۔ اور یہی ہے "اسرارِ کتاب" جس کے متعلق وہ خود فرماتے ہیں۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا

کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر!

(بالِ جبریل - غزل - ۲۹)

تاریخ غریبی

از

صاحبزادہ شوکت علی خاں، ڈائرکٹر عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان، ٹونک

شمالی ہند میں اردو زبان کی قدیم ترین کتابوں میں تاریخ غریبی ایک اہم اور نایاب ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، عطا حسین خان تحسین کی کتاب "نو طرز مرصع" جو قصہ چہار درویش کا پہلا ترجمہ ہے، اس سے بھی پچیس سال پہلے لکھی گئی تھی، یہ ایک ضخیم اسلامی تاریخی مثنوی ہے جس میں نہ صرف تاریخی مواد ملتا ہے، بلکہ ثقافتی اقدار، عصری رجحانات، اسلامی روایات، علوم و فنون کے آثار، اعلام، علمی مباحث، معاشرتی، مذہبی اور تمدنی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں، ......

ظاہر میں یہ ایک مثنوی ہے، لیکن ایک مذہبی، علمی اور ثقافتی گنج گرانمایہ ہے جو اسلامی تاریخ کی شکل میں منظوم کیا گیا ہے، قطع نظر اس کے کہ یہ ایک علمی ذخیرہ ہے، یہ ایک مذہبی مثنوی بھی ہے، یہ ان اہم لسانی ماخذ میں بھی شمار ہونے کے لائق ہے، جو ایک طرف اردو کی تعمیر و فروغ کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد دیتے ہیں، تو دوسری طرف اردو، کے ان علاقوں کی بھی نشان دہی کرتے ہیں، جہاں اردو، ان علاقوں کی مقامی زبانوں کے اثر سے بنتے بنتے پھیلتی گئی، ایک طرف اردو اگر دکن میں جنم لے رہی تھی تو دوسری طرف پنجاب میں اس سے پہلے پیدا ہو چکی تھی، لیکن اس سے کہیں پہلے وہ راجستھان میں بھی پیدا ہو چکی تھی، اور یہاں کے مقامی اثر سے وہ ...... امتزاجی رنگ میں جلوہ گر ہونے لگی تھی۔

تاریخ غریبی اپنی گوناگوں دلچسپیوں اور داخلی شواہد و حقائق کی بنا پر اس امر کی طرف نشاندہی کرتی ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے نصف اوّل میں ہندوستانی زبان کا یہاں خاصہ چلن تھا، جیسا کہ تاریخ غریبی کی زبان سے اندازہ ہوتا ہے، اسی اعتبار سے اردو کی ساخت و پرداخت بھی متعین کرنے میں یہ ایک اہم دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔

علامہ پروفیسر محمود شیرانی نے دو نسخوں میں اس اہم مخطوطہ پر اورینٹل کالج میگزین میں تفصیل سے بحث کی ہے، جو اب مقالات شیرانی کی جلد دوم کی زینت ہے، اس وقت تک ان کے پاس صرف ایک ہی نسخہ تھا، جو موصوف کو سید خیر الدین صاحب وکیل ٹھکانجات جے پور سے دستیاب ہوا تھا، بقول ان کے تاریخ غریبی میں سات سو صفحات ہیں اور دس ہزار اشعار پر محتوی ہے، ادارہ ہٰذا کا نسخہ قدرے مختلف ہے، اُس میں کل صفحات آٹھ سو پچیس ہیں اور کم و بیش دس ہزار سات سو پچیس اشعار ہیں۔ جس کے ہر صفحہ پر تیرہ سطور کا مسطر متعین ہے محمود شیرانی کے نسخہ کی کتابت کا سال ۱۱۴۲ھ ہے اور یہ مذکورہ سال کتابت اس لئے قرار پاتا ہے، کہ اس کے کاغذ پر ۱۱۴۲ھ چھپا ہوا ہے، اور ہمارے نسخہ کا سال کتابت ۱۲۶۷ھ مرقوم ہے جس کا ترقیمہ فارسی میں ہے۔ جو اس طرح ہے۔" ہر کہ خواند دعا طمع دارم، زانکہ من بندۂ گنہگارم، تمت تمام شد کتاب تاریخ غریبی من تصانیف محمد جی میاں ولد شیخ مجتبیٰ کاتب الحروف فقیر حقیر میراں جی میاں بن سید عبداللہ ساکن بنوانہ بتاریخ نہم شہر جمادی الاول ۱۲۶۷ھ من نوشتم صرف کردم روزگار، من نمانم این بماند یادگار، تمت تمام شد، کار من نظام شد۔"!

اس واضح ترقیمہ سے نہ صرف تاریخ کتابت متعین ہوتی ہے، بلکہ مصنف کے نام کا بھی بیّن ثبوت مل جاتا ہے۔ اور کاتب الحروف کا بھی۔ جو محمود شیرانی والے نسخہ میں نہیں ہے، اس لیے کہ خود محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ مصنف کا کہیں نام نہیں ملتا، صرف اتنا ملتا ہے کہ وہ خوب میاں کا

خانہ زاد ہے، اور میاں عیسیٰ اس کے مرشد ہیں، خوب میاں عرف اور سید مرتضیٰ اصل نام ہے، جن کا چھٹی پشت میں حضرت میران سید محمد مہدی جونپوری سے سلسلہ ملتا ہے[1]، بندگی میاں محمد عیسیٰ اہل دائرہ (شیخاواٹی راجستھان) کے مقبول ترین پیشوا گزرے ہیں۔ جو ۱۱۴۱ھ میں عماد الدین کی وفات کے بعد مسندِ ارشاد پر جلوہ افروز ہوئے ہیں، اور ۱۱۵۱ھ میں انتقال کرتے ہیں[2]۔

ایک تیسرا نسخہ ہمیں سیکر سے دستیاب ہوا ہے جو اوّل و آخر سے ناقص ہے، ابتدا سے چار صفحات اور آخر سے چند شعر غائب ہیں، اس کا مسطر بھی تیرہ سطور پر مشتمل ہے کل سات سو چھیانوے صفحات ہیں۔ آخری سرخی اس طرح ہے۔ "ختم الکتاب واللہ اعلم بالصواب" اور جسکا آخری شعر اسطرح ہے۔

اس غریب نیں (نے) لکھی غریبی
بھیجے سب کوں (سب کو) نفع نصیبی

متذکرہ دونوں نسخوں کی کتابت میں اختلاف ہو سکتا ہے، آخر الذکر نسخہ قدرے صاف نستعلیق میں ہے۔ اور پختہ ہے، اور بارہویں صدی ہجری کے آخری نصف میں مکتوبہ ہے، اور بہت ممکن ہے کہ یہی مصنف کا اصل نسخہ ہو، اس لیے کہ اب تک مصنف کا اصل نسخہ معلوم نہیں ہو سکا ہے، ایک تو مرورِ ایام سے اس کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا، دوسرے اس کا ترقیمہ نہ ہونے سے دورِ کتابت کا یقین ہونے میں دشواری درپیش ہے، تیسرے یہ کہ اس علاقہ میں سے دستیاب ہوا ہے، جہاں مہدویہ تسلط رہا ہے، یعنی شیخاواٹی کے علاقہ سیکر کی ایک درگاہ کے سجادہ نشین کے پاس سے ملا ہے، شیرانی صاحب والے نسخہ کو اگر ۱۷۴۲ء کے کاغذ پر چھپے سال کو سال کتابت مان لیا جائے تو ان کے نسخے کو تقدم زمانی حاصل ہو جاتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس سال کاغذ کی

[1] مقالات محمود شیرانی جلد دوم۔ ص ۲۴۷ [2] ایضاً

ساخت ہوئی ہو اسی سال کتابت بھی کی گئی ہو۔ ۱۷۴۲ء میں کاغذ بنا، ہندوستان کب آیا، اور کب تک رہا۔ اور پھر کب کتابت ہوئی یہ کوئی یقینی نہیں ہے، اگر یہی سال کتابت مان بھی لیا جائے تو تاریخ کتابت ۱۱۵۵ھ قرار پاتی ہے اور سال تصنیف ۱۱۶۰ھ مرقوم ہے اس لحاظ سے تاریخ تصنیف سے پہلے کس طرح کتابت کی جا سکتی ہے کاغذ کی ساخت کا سال کاغذ پر ۱۷۴۲ء درج ہے، جو ۱۱۵۵ھ سے مطابقت کرتا ہے، اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ تینوں نسخ میں صرف ادارے کے مخزونہ نسخے کی کتابت متعین ہے، جو سال تصنیف کے ستانوے سال بعد ہوئی ہے، حالانکہ سیکر والے نسخے کو تقدم زمانی حاصل ہے، لیکن اسکی تاریخ کتابت درج نہیں ہے، یہ امر بھی قابل غور ہے کہ یہی نسخہ زیادہ مستند معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ راجستھان میں دائرہ شیخاواٹی کے علاقے میں مہدویہ خانوادے میں محفوظ رہا ہے، جیسا کہ ترقیمہ میں اور صفحہ اوّل و سوم کی مرقومہ تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے، ترقیمہ میں کاتب نے اس تصنیف کو محمد جی میاں بن شیخ مجتبیٰ کی بتایا ہے، اور اپنا نام کاتب الحروف فقیر حقیر میران جی میاں ابن سید عبد اللہ ساکن نبوارہ لکھا ہے۔

یہ حضرت میران سید محمد مہدی جونپوری جو مہدوی سلسلہ کے بانی مبانی تھے، ان کی اولاد یا سلسلہ سے معلوم ہوتے ہیں، نام کی نسبت بھی اس امر واقعہ کی طرف دلالت کرتی ہے، تیسرے صفحہ پر یہ تحریر ہے، "این کتاب فقیر میرانجی صاحب منجھلے میاں است، اگر کسے دعویٰ کند دروغ باشد"۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مالک کتاب اور کاتب الحروف ایک ہی ہیں جن کو عرف عام میں منجھلے میاں بھی کہتے تھے، جن کا اصلی نام سید محمود تھا، جیسا کہ صفحہ اوّل کے ایک نوٹ سے ظاہر ہوتا ہے، جس سے تاریخ وفات کاتب بھی برآمد ہوتی ہے، وہ نوٹ اس طرح ہے۔ "بتاریخ بست و ہفتم ماہ رجب ۱۱۳۰ھ روز دوشنبہ وقت نماز ظہر انتقال قبلہ سید محمود معروف میرانجی میاں صاحب مرحوم شد"۔ ان تحریروں سے یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ اسم مصنف متعین ہو جاتا ہے، اس لیے کہ کاتب نے تاریخ غریبی کو من تصانیف محمد حاجی میاں ولد شیخ مجتبیٰ لکھا ہے۔

۲۔ اس نسخہ کی ملکیت بھی کاتب الحروف کی رہی ہے، جو اس نے خود مصنف کے تعلق خاطر سے اپنے لیے لکھا ہوگا۔

۳۔ کاتب الحروف کا سالِ وفات بھی اسی سے واضح ہو جاتا ہے۔

۴۔ کاتب کا اصل نام، عرفیت، ولدیت اور مصنف کا نام مع ولدیت بھی ان تحریروں سے متعین ہو جاتے ہیں، لیکن مصنف اور کاتب کے حالات پھر بھی پردۂ خفا میں ۔ ۔ ۔ ہیں، پروفیسر محمود شیرانی نے مصنف کا نام بھی نہیں بتایا، صرف قیاساً یہ بتایا ہے کہ شاید غریب مصنف کا تخلص ہو، جو خوب میاں کے خانہ زاد اور میاں عیسیٰ کے مرید معلوم ہوتے ہیں، ہمارے نسخہ سے مصنف کا نام ضرور متحقق ہو جاتا ہے، لیکن حالاتِ زندگی اور دوسری تصانیف کا پتہ نہیں چلتا، مصنف عالم دین اور متبحر فاضل ضرور نظر آتے ہیں، جیسا کہ ان کی اس گرانقدر تصنیف سے مترشح ہوتا ہے اور پھر ترقیمہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے، کہ انکی اور تصانیف میں سے یہ تاریخ غریبی ایک اہم تصنیف ہے۔

تاریخ تصنیف:۔ پروفیسر محمود شیرانی نے داخلی شواہد کی روشنی میں تصنیف کی تاریخ متعین کی ہے، کہ چھ سال میں یہ کتاب مکمل ہوئی۔ اس لیے کہ ابتدائی اشعار میں ایک شعر یوں ہے۔

گیارہ سے چوسٹھ پر بنی
پوری کری فضل کر دھنی

ترقیمہ کے آخری شعروں میں اس طرح ہے۔

شہر بیانے میں یہی پوری ہوئی کتاب — لکھے پڑھے جو کوئی سنے سبکوں ہوئے ثواب

تیرھویں جو صفر کی پیر بارینہ آج — گیارہ سو ستر بھٹے ہوا سو پورن کاج

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ۱۱۶۴ھ میں کتاب کی ابتدا ہوئی اور ۱۱۷۰ھ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ جیسا کہ اوپر کے دونوں شعروں سے ظاہر ہوتا ہے، اور یہ تصنیف بیانہ میں ہوئی ہے، جو بقول شیرانی صاحب مہدویہ خانوادے کے مراکز میں سے ایک اہم شہر رہا ہے، بیانہ بھرتپور میں ہے، اور اب بھی یہاں کے قدیم آثار و کتبات عہد رفتہ اور عظمت پارینہ کی یاد دلاتے ہیں۔

اس نسخہ پر کاتب نے ترقیمہ میں اپنے آپ کو ساکن نوانہ بتایا ہے، جو شیخاواٹی علاقہ میں ہے، اور دائرے کے قریب ہے، دائرہ شیخاواٹی کا قدیم علمی مرکز رہا ہے، جہاں مہدوی تسلط و مرکزیت کے آثار و اعلام، سندات و مخطوطات اور تبرکات کی شکل میں اب بھی موجود ہیں، تیسرا نسخہ شیخاواٹی کے ایک اور ضلع سیکر سے دستیاب ہوا ہے جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، پروفیسر محمود شیرانی کو بھی یہ اسی علاقہ سے فراہم ہوا تھا، اس طرح محمود شیرانی نے جب تاریخ غریبی پر مقالہ لکھا تھا، اس وقت صرف یہی ایک نسخہ معرض وجود میں تھا، جو پنجاب لائبریری لاہور کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد ہمیں دو نسخے اور مل چکے ہیں، دونوں اس ادارے میں موجود ہیں، تاریخ غریبی کا زیر نظر نسخہ جس کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، ان تینوں میں مکمل ترین نسخہ ہے حالانکہ وہ بھی اصل نہیں ہے، ۱۲۶۷ھ کا نوشتہ ہے، لیکن مکمل معلومات کا حامل ہے۔

کتاب حمد و نعت و منقبت سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد مہدویہ سلسلہ کے جو پانچ اصحاب کبار ہیں ان کے مناقب کے ساتھ مثنوی آگے بڑھتی ہے، پھر آفرینش نور محمدی سے حضور سرور کائنات فخر موجودات صلعم کے حالات و واقعات سے بحث کرتی ہے، جس میں انبیائے کرام کے قرآنی قصص بھی بیان کیے گئے ہیں، اور علمی و دینی مباحث، احادیث اور آیات قرآنیہ بھی پیش کی گئی ہیں، اور مثنوی کے زور کلام اور اقدار کے پیش نظر اخلاقی اور سبق آموز قصے بھی بیان کر گئے ہیں۔

جن میں قرآنی قصص کے علاوہ اولیائے کرام کے مشہور واقعات بھی ملتے ہیں، احادیث اور فقہی فروع
واصول کی روشنی میں بھی بہت سے واقعات کو قلمبند کیا گیا ہے۔ جو اسلامی معاشرے اور ثقافتی
ومذہبی اقدار کو پیش کرتے ہیں، ہر عنوان کو سرخیوں میں لکھا ہے، اور ہر واقعہ کے بعد کچھ دوہے، اور
سورٹھے بھی دیئے ہیں، محمود شیرانی نے اس کو مثنوی ہی قرار نہیں دیا ہے۔ بلکہ اس کے وزن کو ہندی زا
کہا ہے، جس کو حضرت امیر خسروؒ نے فارسی سے متعارف کرایا تھا۔

تاریخ اردو، قدیم اردو کے ماٰخذ میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ اس لیے کہ اب تک جن قدیم
مخطوطات کا ذکر ملتا ہے۔ ان سے دکنی، ہریانی، پنجابی اور گجراتی زبانوں کے اثرات اردو میں
دکھائی دیتے ہیں۔ اب تک راجستھانی زبان کے اثرات مکمل طور سے روشناس نہیں ہوئے۔
پہلی بار اس ضخیم مثنوی تاریخ غریبی سے اردو کے لسانی ارتقاء میں راجستھانی اثرات پوری پوری
طرح واضح ہوتے ہیں۔ اس کے ذریعہ نہ صرف لسانی ارتقاء میں راجستھان کا اثر دکھائی دیتا ہے۔
بلکہ راجستھان کے مختلف بالخصوص مارواڑی اور ڈھونڈاری زبانوں کے اثرات، تصریفی قواعد،
ضرب الامثال وغیرہ کا مکمل طور سے اثر ملتا ہے۔ راجستھانی اثرات سے بہت سے الفاظ کی
نئی شکل بدلی ہوئی ملتی ہے، جو قدیم اردو میں پائے جاتے ہیں۔ ان قدیم الفاظ کا اس کتاب میں
کافی ذخیرہ ملتا ہے، جیسے باج سے باجن، جو باج کی جمع ہے (گانے والا)، قندیل راجستھان میں مستعمل ہے
جس کی جمع قندیلاں اس کتاب سے ظاہر ہوتی ہے، جیسا کہ راجستھانی زبان میں رائج ہے، بہت سے
الفاظ راجستھان میں مستعمل ہیں، جو اب تک ٹونک کے عوام الناس میں بھی بولے اور سمجھے جاتے ہیں
جیسے باورچی کو بیرچی، جانور کو جناور، چوٹی کو چٹیا، بھتیجا کو بھاجی، بائیں کو بادیں، تو کو تئیں، تیرا کو
توسوں، تجھکو کو تجھکوں، کب کو کد، ایسا کو ایساں، کبھی کو کبھو، بے خبر کو بے خبرا، جماعت کو جمات
وکیل کو وکیلا، سوکو سے (سیکڑا)، اسی طرح بہت سے ایسے الفاظ جو خاص طور پر راجستھانی

ہی ہیں، تاریخ غریبی میں بکثرت پائے جاتے ہیں جو اردو میں راجستھانی اثر کو بلاواسطہ ثابت کرتے ہیں۔
بوجیو، دیجو، لیجو، بتلاجے، چلاجے، دے ہوں، لے ہوں، لوں گا، دوں گا، اس کوں، جائے کو جاجے
بتائے کو بتاجے، کہئے کو کہہ جے، رہنے کو رہ جے، ان اشعار میں سے یہ چند الفاظ منتخب کیے ہیں طوالت
کے خوف سے تمام اشعار کوٹ کرنے کے بجائے صرف دو شعر ہی پیش کیے جاتے ہیں۔

اس کوں اپنے پاس بلاجے بھانت بھانت سمجھاجے
سب کو اللہ نیکی دیجو خیر عاقبت ان کی کیجو،

اور اس کے مطالعہ سے بہت سے راجستھانی محاورات ملتے ہیں مثلاً" بندی وان اب تک
قیدی کے معنی میں بولا جاتا ہے، اور پریشانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، رسانا بمعنی غصہ ہونا جھلکانا
چمکانا کے معنی میں، جام پھل امرود، پسارنا، پھیلنا یعنی پاؤں پسارنا، پاؤں پھیلانا، سودھی، سیدھی
کے بجائے، دھرا بمعنی رکھنا، اپڑ جانا؛ دھڑ جانا کے معنی میں لوگ، لگائی، مرد وعورت کے معنی
ہیں۔ یہ ارادہ ارادت کا بگڑا ہوا ہے، بُہار دینا، جھاڑو دینا کے معنی ہیں۔ ہارے ہونا یعنی تھک جانا
بوڑھی ہونا، باز آنا، باؤ، ہوا، نٹنا، انکار کرنا۔ ٹیبا۔ ٹیلہ، راجستھانی اثرات کے علاوہ عربی فارسی
کے الفاظ کا غلبہ بھی نظر آتا ہے، چند الفاظ اپنی ہئیت بگاڑ کر راجستھانی اثر سے بالکل الگ سے
لگتے ہیں، جیسے احد کو احدا" لکھا ہے کہیں اول احد لکھا ہے، جو پہلے اور ایک کے معنی میں استعمال
ہوا ہے، صفت، تردد، غریب، عاجز جیسے یہ غریب عاجز تبلادے، یا ایک تردد دل میں آئے۔
نفع نصیبی، غریبی کے وزن کی خاطر نصیبی لکھ دیا گیا۔ مثلاً"

اس غریبی نیں رتے، لکھی غریبی
پہنچے سب کوں دسب کو نفع نصیبی

نے کے بجائے نیں۔ کو کے بجائے کوں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہیں تو راجستھانی اثرات سے

الفاظ بگڑے ہوئے ہیں، کہیں بدل کے آتے ہیں، اور کہیں جو عربی فارسی کے الفاظ استعمال ہوئے ہوتے بگڑ کر راجستھانی میں داخل ہو گئے، ایسے الفاظ بھی اس میں بکثرت ہیں، اور بہت سے ایسے الفاظ بھی اس میں کثرت سے ملتے ہیں، جو مصنف نے ضرورتِ شعری اور قافیہ کی خاطر خود بدل دیئے ہیں۔ اور ان کی املا تک بدل ڈالی۔ املا کی بدلی ہوئی شکل میں سمجھتا ہوں کاتب کی مرہون منت ہے۔ قافیہ کی کوئی پابندی نظر نہیں آتی۔ طا کو تا، الف کو عین سے بدل دیا، اور سین کو صاد سے بدل ڈالا، زا کو ضاد سے۔ حائے حطی کو ہائے ہوز سے بدل دیا۔ ضرورتِ شعری کے لحاظ سے کہیں الف گرا دیا۔ کہیں الف کو عین سے بدل دیا۔ کہیں صحیح کو راجستھانی تلفظ کی طرح صحی لکھدیا۔ قافیہ کی پابندی کی خاطر اکثر املا کے قواعد کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، پوری مثنوی میں مارواڑی اور ڈھونڈاری زبان وبیان کے پرتو زیادہ نظر آتے ہیں۔ جو مقامی رسم الخط کو بھی کہیں کہیں ظاہر کرتے ہیں۔

مثنوی تاریخ غریبی ایک علمی، مذہبی اور لسانی اعتبار سے ایک اہم تصنیف تو ہے ہی ثقافتی اور ادبی لحاظ سے بھی ایک قابلِ قدر سرمایہ ہے، جو ایک طرف اگر لسانی مباحث چھیڑتی ہے تو دوسری طرف علمی، ادبی اور مذہبی معلومات بھی فراہم کرتی ہے، بلکہ اس دور کے اقدار، اطوار، آثار اور مروجہ اصطلاحیں، اور روزمرہ کے محاورات، عربی فارسی کے بگڑے ہوئے الفاظ کا ذخیرہ راجستھانی شکل میں لسانی تغیر وتبدل انداز فکر، طرز تحریر اور مقامی زبان وبیان سے فارسی زبان کی آمیزش سے جو خوش رنگ امتزاج پیدا ہو جاتا ہے، اس کا پورا پورا اثر اس مثنوی سے جلوہ گر ہوتا ہے، جو اردو کے راجستھان پر اثرات اور راجستھان کے اردو، فارسی پر اثرات کی ترجمانی کرتی ہے، یہی نہیں بلکہ جہاں اس سے اسلامی تاریخ وتمدن اور مذہبی روایات وحقائق سامنے آتے ہیں، راجستھانی ثقافتی جھلکیاں بھی سامنے آتی ہیں، جو ہمارا مشترکہ تہذیبی سرمایہ اور ثقافتی ورثہ ہے، ایک طرف اگر تاریخ غریبی اردو کے ابتدائی خط وخال متعین کرتی ہے۔

تو دوسری طرف مشترکہ تہذیب کے دل پسند اور بیش بہا سرمایہ کی بھی نشاندہی کرتی ہے، جہاں وہ تاریخی روایات وحکایات کو پیش کرتی ہے، وہاں راجستھان میں ہندو یہ تسلط کے آثار و اقدار اور عصری اثرات وروایات کو بھی منظر عام پر لاتی ہے، اس لیئے اس تاریخ سے اب ہمیں نہ صرف اردو کے لسانی تاریخ کا مطالعہ کرنا پڑے گا، بلکہ اس میں الفاظ ومعانی اور محاورات وروایات کا جو غیر معمولی ذخیرہ ہے، اس کو بھی پرکھنا پڑے گا، جہاں تاریخ کے آثار واعلام پر تبصرہ کرنا پڑے گا۔ وہاں علمی ادبی اور مذہبی قدروں کو بھی دیکھنا پڑے گا، ایک حد مقرر کرنی ہوگی، اور ایک درس متعین کرنا ہوگا، اس اعتبار سے تاریخ غریبی اردو زبان وادب کا ایک بیش بہا اور قابلِ قدر ماخذ ہے، جو اپنے داخلی شواہد وحقائق، لسانی ساخت وپرداخت اور امتیازی شان امتزاج کے لحاظ سے اپنے دور کی اہم بالشان دستاویز ہے۔

نقوش سلیمانی

ہندوستانی اور اردو زبان وادب سے متعلق مختلف ادبی کانفرنسوں کے خطبہ ہائے صدارت، تقریروں، تحریروں، تنقیدوں، تبصروں اور مقدموں کا مجموعہ جن کا انتخاب خود فاضل مصنف نے اپنی زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا۔ اسی اڈیشن کا عکسی اڈیشن اسی اہتمام کے ساتھ دارالمصنفین نے معارف پریس میں چھپوا کر شائع کیا ہے۔ یوں تو اس مجموعہ کا ہر مضمون مصنف کی تلاش وجستجو اور تحقیق کا شاہکار ہے۔

قیمت ۳۹ روپیے "منیجر"

اسلام اور مستشرقین جلد اوّل
پر
کچھ اظہارِ خیالات

از جناب شیخ نذیر حسین صاحب

مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،

مکرمی و معظمی جناب سید صاحب السلام علیکم

دارالمصنفین کے سمینار ۱۹۸۲ء کی روداد کی پہلی اور دوسری جلد موصول ہوئی، آپ نے جس محبت اور خلوص سے میرا ذکر کیا ہے، میں اس کے لیے شکر گذار ہوں۔

روداد کی جلد اوّل (صفحہ ۸۳) میں مفتی سیاح الدین کاکاخیل کی تقریر پڑھ کر حیرت اور افسوس ہوا، میرا گمان ہے کہ انھوں نے سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرکے اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کے خلاف غلط بیانی کی کوشش کی ہے، انھیں بغور دیکھنے اور پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا، ان کی یہ ساری تقریر بے خبری، اور تنگ نظری کی دلیل ہے۔

مفتی سیاح الدین صاحب پاکستان میں رہتے ہوئے ہماری غلطیوں اور فردگذاشتوں (اگر فی الواقع کوئی ہوں) کی نشاندہی کر سکتے تھے، اور ہم ان کی بروقت تصحیح بھی کر سکتے تھے، ہم خط وکتابت سے ان کی غلط فہمی کو دور کرکے ان کی پوری تسلی و تشفی بھی کر سکتے تھے،

ہم انھیں اطمینان دلا سکتے تھے کہ ہم مستشرقین کے تعصب اور ان کی غلط بیانیوں سے اچھی طرح واقف ہیں، اور ہم علوم اسلامیہ کی ترجمانی ان سے بہتر انداز میں کر سکتے ہیں، خدا معلوم کہ انھوں نے غصہ نکالنے کیلئے دارالمصنفین کے سمینار کو کیوں پسند کیا، شاید انھیں کسی وجہ سے کوئی ذاتی شکایت ہے۔

بہرحال میں مفتی سیاح الدین صاحب اور ان کے دوسرے ہم نواؤں کی آگاہی کے لیے اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی امتیازی خصوصیات کا ذکر کرتا ہوں جن کی وجہ سے اس تصنیف کو ایک جداگانہ اور مستقل حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

۱۔ مقالات میں ضروری اضافے، ترمیم و تنسیخ اور اضافات اسلامی تصورات اور اسلامی سوانحی کتاب کی روشنی میں کئے گئے ہیں۔

۲۔ اصل مقالات میں سنین، واقعات، حقائق اور مآخذ میں ضروری تصحیح کی گئی ہے۔

۳۔ پاکستان اور اسلامی ہند سے متعلق اہم موضوعات پر نئے مقالات لکھوائے گئے ہیں۔ اور برصغیر کی ممتاز شخصیتوں کو خاص طور پر شامل کیا گیا ہے۔

۴۔ اسلامی عقائد، نظریات اور عبادات پر نئے مضامین عملۂ ادارات نے خود لکھے ہیں یا پاکستان کے مشاہیر اہل علم سے لکھوائے گئے ہیں، اس بارے میں ہمیں مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم (کراچی)، اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (پیرس) کی قلمی معاونت حاصل رہی ہے۔

۵۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ اور آپ کی حیات طیبہ کے مختلف گوشوں پر ایک مبسوط مقالہ، جو ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے، ایک رکن ادارہ نے لکھا ہے۔

۶۔ قرآن مجید کی تمام سورتوں کے مطالب و مضامین پر علیحدہ علیحدہ مقالات لکھے گئے ہیں،

۷۔ اسلامی اور پاکستانی زبانوں اور ان کے ادب پر جامع مقالات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۸ ۔ اسلامی ادبیات (عربی، فارسی، اردو پنجابی وغیرہ) میں نعت گوئی کے موضوع پر ایک سلسلہ مضامین لکھوایا گیا ہے۔

۹ ۔ اسلامی ممالک (انڈونیشیا سے لیکر موریطانیہ تک)، کے آجکل کے حالات کی طرف خاص توجہ مبذول کی گئی ہے، اور اسلامی تحریکات کو خاص جگہ دی گئی ہے۔

۱۰ ۔ جلد ۱۴/۱ کا موضوع علم اور علما ہے، اور یہ جلد جملہ علوم اسلامیہ کی تاریخ کے لیے وقف ہے، یہ سارے مقالات علمۂ ادارت کے نتائج قلم کا نتیجہ ہیں، جن کو مفتی صاحب مترجمین کے حقیر نام سے یاد کرتے ہیں۔

۱۱ ۔ اسلامی ہند کی اہم شخصیتوں اور مشاہیر اہل علم کے متعلق نئے مقالات لکھے یا لکھوائے گئے ہیں، مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ انگریزی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (قدیم) میں نواب سید صدیق حسن مرحوم پر مضمون آدھے صفحے کا ہے، جو ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ اباد یونیورسٹی) کا تحریر کردہ ہے، جب کہ ہم نے نواب صاحب کے حالات چار، پانچ صفحات میں لکھ دیئے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے نئے انگریزی ایڈیشن میں کراچی کے ایک مسلمان مقالہ نگار نے، جو خیر سے اس کے علمۂ ادارت میں بھی شامل ہے، "دارالعلوم" کے عنوان پر ایک مختصر سا مقالہ لکھا ہے، جس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو کا ذکر نازیبا الفاظ میں کیا ہے جب کہ راقم السطور نے ۳۰ ۔ ۴۰ صفحات کا مفصل مقالہ بعنوان مکاتب و مدارس لکھا ہے۔

اور اس میں عالم اسلامی کے دینی مدارس (زمانہ قدیم سے عصر حاضر تک)، کے حالات کے علاوہ بھارت کے موجودہ عربی مدارس بشمول ندوۃ العلماء کا مناسب الفاظ میں ذکر کیا ہے، یہ مقالہ ڈاکٹر سید سلمان ندوی (ڈربن) دیکھ اور پڑھ چکے ہیں۔

اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب صدر شعبہ، جن کی جلد صحت یابی کے ہم سب

متمنی ہیں، کے مبسوط مقالے "المتعلم و المعلوم" کا ذکر بھی مناسب ہوگا، جس میں اسلام کے اصول تعلیم و تربیت پر حکیمانہ گفتگو کی گئی ہے، اور یہ خاصے کی چیز ہے، اس طرح کے سینکڑوں نئے مقالات ہیں، جن کا ذکر موجب طوالت ہوگا۔

۱۲ ۔ جو موضوعات مطبوعہ جلدوں میں شائع نہیں ہو سکے یا جن مشاہیر کا ذکر نہیں آسکا ان کے حالات کے لئے ایک علیحدہ جلد پیش نظر ہے، جس کا نام تکملہ ہوگا۔

۱۳ ۔ مختصر اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی تدوین کا آغاز کر دیا گیا ہے۔

اب یہ فیصلہ ناظرین معارف، شرکائے سیمینار اور دوسرے اہل علم کے ہاتھ ہے کہ آیا اردو دائرہ معارف اسلامیہ صرف یہودی مستشرقین کے مقالات کی نقل ہے یا ادارہ کے شرکائے کار نے خود بھی بے شمار نئے مضامین لکھ کر اس میں اپنی آنکھوں کا تیل اور جگر کا خون بھی شامل کردیا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ۲۷ جولائی ۱۹۷۰ء کو اپنے بھتیجے محمد میاں مرحوم اور مولوی معین اللہ نائب ناظم ندوۃ العلماء کی معیت میں ہمارے ادارے میں تشریف لائے تھے، انھوں نے اپنے تاثرات میں لکھا۔!

"برسوں سے آرزو تھی کہ اس عظیم الشان علمی کام کے مرکز اور اس کی سرگرمی کو بچشم خود دیکھوں اور اس کے فاضل رفقاء و شرکائے کار سے ملوں ..... جب سے یہ کام مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم کی نگرانی میں شروع ہوا، اس وقت سے میرے دل میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی، اور میں اس کو پاکستان کے لیے باعث فخر سمجھتا تھا، واقعہ یہ ہے کہ جس پیمانے اور جس بلند ہمتی اور دیدہ وری و دیدہ ریزی سے یہ کام (جو عالم اسلام کے ذمہ عرصہ دراز سے قرض اور فرض تھا)، یہاں انجام پا رہا ہے، اس کی نظیر عرب ملکوں میں (جن میں علمی حیثیت سے

مصر سب سے آگے ہے ، جو اس کام کی تکمیل کے سب سے زیادہ مستحق تھے ، نہیں
پائی جاتی "۔

"میں حکومت پاکستان ، پنجاب یونیورسٹی اور دائرہ معارف اسلامی کو اس پر مبارکباد
پیش کرتا ہوں اور دل سے دعا کرتا ہوں کہ یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا کر مسلمانوں کے لیے باعث
سرخروئی اور تمام دنیا کے اہل علم اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے تحفہ بے بہا ثابت ہو"۔

چند ماہ ہوئے ہم نے بعض ہندی مشاہیر علما (مولانا محمد الیاس ، محمد اعلی تھانوی ۔
(کشاف اصطلاحات الفنون) اور محمد انور شاہ) پر لکھے ہوئے مطبوعہ مضامین کی نقلیں مولانا
موصوف کی خدمت میں بغرض تبصرہ روانہ کی تھیں ، ان مضامین کو پڑھ کر حضرت مولانا
نے راقم السطور کے نام خط میں یہ لکھا ۔

لکھنو ۔ ۱۰ فروری ۱۹۶۶ء

مکرمی شیخ صاحب زید لطفہ

عنایت نامہ معہ اردو انسائیکلوپیڈیا کے تراشے کے ملا ۔ مولانا الیاس صاحب پر
اس میں اچھی تلخیص آگئی ہے ، آپ نے انسائیکلوپیڈیا کی شکل میں بڑی علمی و دینی خدمت
انجام دی ہے ، اللہ تعالے قبول فرمائے ، امید ہے کہ بقیہ جلدیں بھی ندوۃ العلماء کی لائبریری
پابندی سے بھیجتے رہیں گے ، خدا کرے سب طرح سے خیریت ہو ۔

مخدومی ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی خدمت میں سلام والسلام ۔ ابوالحسن علی

چند برس ہوئے کہ مصر سے لائیڈن کے SHORTER ENCYCLOPAEDIA
OF ISLAM کا عربی ترجمہ الموسوعۃ العربیہ المیسرہ (قاموس الاسلامی) کے نام سے شائع ہوا
تھا ۔ اس کے بے بصر مترجموں نے کسی حذف و اضافہ اور اصلاح و تبدیلی کے بغیر یہ ترجمہ شائع

کر دیا تھا ۔ اس پر پیپر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے استاد انور الجندی (قاہرہ) نے ابوظبی کے مجلہ منار الاسلام
(۱۱ مارچ ۱۹۶۶ء) میں لکھا ہے کہ الموسوعۃ العربیہ المیسرہ کے مترجموں کے لیے یہ مناسب
تھا کہ وہ ترجمہ کرتے وقت پنجاب یونیورسٹی کے شائع کردہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ
کو پیش نظر رکھتے ۔

اب اہل علم ذرا غور فرمائیں کہ دنیائے اسلام کے دو جلیل القدر مصنف و مفکر ہمارے
کام کی تحسین و تصویب فرما رہے ہیں اور ایک ہمارے مفتی صاحب ہیں ، جو دار المصنفین کے
سیمنار میں ہمارے خلاف قرار داد پاس کرانے اور ہمارے کئے کرائے پر خط تنسیخ پھرانے
کے لیے کوشاں تھے ، مفتی صاحب ساری عمر لائل پور (فیصل آباد) کی جامع مسجد میں دینی
کتب پڑھاتے اور ان کی شرحوں و حاشیوں کی ورق گردانی کرتے رہے ہیں ، علمی تحقیق کا جدید انداز
اور نیا پیرایہ بیان ان کے ذوق و مزاج سے مختلف اور ان کے فکر و نظر کی سطح سے ذرا اونچا ہے ۔
اس لیے وہ استشراق کے وسوسوں میں پھنس گئے ہیں ۔ ع

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است

بہر حال میں مفتی صاحب اور ان جیسے دوسرے کرم فرماؤں کی اطلاع کے لیے
عرض کرتا ہوں کہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے شرکائے کار انگریزی کے علاوہ
علوم عربیہ اسلامیہ میں بھی درک رکھتے ہیں ، اور قومی غیرت و دینی حمیت میں کسی
بڑے سے بڑے مولوی سے پیچھے نہیں ہیں ۔ ان میں سے بیشتر کی عمریں پڑھنے پڑھانے
تصنیف و تالیف اور تحقیق و تدقیق میں گذری ہیں ، اور ان کی علمی خدمات کا اعتراف
بیرون ملک کے فضلا نے بھی کیا ہے ۔

میں یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ ہمارا یہ کام غلطیوں اور فرو گذاشتوں سے

بالکل مبرا اور پاک ہے، کیونکہ کسی انسان کی علمی کاوش کو حرف آخر کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، کہ علم و تحقیق کا قدم ہمیشہ آگے بڑھتا رہتا ہے، ہمیں اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا پورا احساس و اعتراف ہے، لیکن میں صاحبان علم و فضل اور ارباب ذوق کی خدمت میں یہ گزارش ضرور کروں گا، کہ وہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) کا مقابلہ و موازنہ دیگر ممالک اسلامیہ کے شائع کردہ عربی، فارسی اور ترکی کے اسلامی انسائیکلوپیڈیاؤں سے کرکے ہمارے کام کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں۔

۱۱ جون ۱۹۸۶ء

مکاتیب شبلی حصہ اول و دوم

مولانا شبلیؒ نے اپنی ۵۷ سالہ زندگی میں اپنے اعزا و تلامذہ و احباب کو ہزاروں خطوط بھی لکھے تھے، جن کے جمع کرنے کا خیال سید صاحبؒ کو مولانا کی زندگی ہی میں ہوگیا تھا، مگر یہ مولانا کے انتقال اور دارالمصنفین کے قائم ہونے کے سال کے دو سال کے بعد مکتوب الیہم سے حاصل کرکے جمع کیے گئے، جو دو جلدوں میں آئے، ان خطوط میں مولانا کے ملی و قومی خیالات، و تعلیمی افکار، ادبی و تاریخی نکات، مذہبی و دینی جذبات سب اکٹھا ہوگئے ہیں، یہ درحقیقت مولانا کے عہد کی ہر قسم کی اجتماعی جدوجہد کی تاریخ ہے۔

پہلی جلد میں عزیزوں اور ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر احباب کے نام خطوط ہیں، اور دوسری جلد تمام تر ان کے لائق تلامذہ، اور شاگردوں کے نام کے خطوط پر مشتمل ہے، اس سے ادب کی صنف خطوط نگاری میں بھی مولانا کے مرتبہ کا اندازہ ہوجائے گا، یہ تمام خطوط ماہر صاحب علم و ادب کے مطالعہ کے لائق ہیں۔

قیمت علی الترتیب - ۲۲ روپیہ و ۱۸ روپیہ

(۲)

حضرت محترم و مکرم السلام علیکم و رحمۃ اللہ تعالیٰ و برکاتہ

نامہ گرامی مورخہ ۱۶ مئی ۱۹۸۶ء مجھے ۱۸ جون ۱۹۸۶ء کو مل گیا، اور اس کے ساتھ "اسلام اور مستشرقین" مقالات کے مجموعے بھی، جلد اول، جلد دوم، جلد چہارم، جلد پنجم، اور اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمین مصنفین (جلد سوم عدم وصول ہے جو زیر طبع ہے)، آج جمعہ کو میں نے ان مقالات کو از اول تا آخر دیکھا، بلکہ جلد اول تو کہنا چاہیئے کہ سب ہی پڑھ ڈالی، آپ نے جس انداز سے تحریر فرمایا ہے میں نے خود کو ایک بار پھر دارالمصنفین میں پایا۔

میں بخوبی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ ان مقالات کی تدوین اور ترتیب میں کیا کیا مراحل درپیش رہے ہوں گے، حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر بڑا کام کس طرح آپ نے کر ڈالا ہے، ان مقالات کی بڑی اہمیت ہے، میں اب زیادہ محسوس کرتا ہوں کہ "اسلام اور مستشرقین"۔ ۔ ۔ کانفرنس اعظم گڈھ میں نہ ہوتی تو اس درجہ قابل لحاظ و قدر مواد جمع ہونا ممکن نہ ہوتا، ازراہ کرم میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے اس عظیم خدمت پر۔

آپ نے میرا ذکر بڑی محبت سے فرمایا ہے، میں تو اب تک قیام کیلئے تو تعمیر کردہ کمرے کے اہتمام کو فراموش نہیں کرسکا ہوں، اب جلد اول میں آپکے قلم سے لکھا ہوا اپنا حال پڑھ کر حیران ہوں کہ کیسے شکریہ ادا کروں ممکن نہیں ہے۔

ایک دکھ یہ بھی ہے کہ حضرت مفتی عتیق الرحمان صاحب اور پروفیسر سعید اکبرآبادی اب ہمارے درمیان نہیں ہیں، ان دونوں نابغہ روزگار علما سے میرے ذاتی تعلقات قدیم تھے، جلد اول میں انکا حال پڑھا تو دل بے قرار ہوگیا، حضرت مفتی صاحب سے دہلی میں دو بار جاکر ملا تھا، ان کو میں نے ہمیشہ پر امید پایا، معذوری کو انھوں نے بڑے حوصلے کے ساتھ قبول کیا تھا، پروفیسر اکبرآبادی تو کراچی میں تھے، اپنے بارے میں وہ خود نہیں جانتے تھے، مگر میں جانتا تھا کہ ان کا بچنا ممکن نہیں، آخر دم تک ہم نے ان کو نہیں بتایا کہ سرطان جگر کے وہ مریض ہیں، یہاں ان کی دختر نیک اختر نے ایک اکیڈمی ان کے نام پر بنائی ہے افتتاحی تقریب میں میں بھی شریک ہوا تھا، خدا کرے کہ انکے مقالات چھپ سکیں۔

آپ کا مخلص

حکیم محمد سعید

ادبیات

غزل

از

جناب وارث ریاضی ایم اے، چمپارن، بہار

کبھی نزدیک رہتا ہے کبھی وہ دور رہتا ہے
وہ اپنی فطرتِ سیماب سے مجبور رہتا ہے

وہ جلوے جو فریبِ آگہی دیتے ہیں نظروں کو
انھیں جلوؤں کی تابانی سے دل پُر نور رہتا ہے

سنا ہے جب سے میں نے "وادیِ ایمن" کا افسانہ
تجلی ریزِ دل میں مثلِ شعلہ طور رہتا ہے

نگاہِ عشق سے وہ "حُسنِ پنہاں" چھپ نہیں سکتا
اگرچہ نکہتِ گُل کی طرح مستور رہتا ہے

سمجھتا ہے جو اپنے آپ کو مجبور دنیا میں
وہی انساں ہر اک گام پہ مجبور رہتا ہے

نہ جانے کون ہے وہ بے نیازِ جام و میخانہ
کہ جو پیتا نہیں، آٹھوں پہر مخمور رہتا ہے

جمالِ علم و دانش ہے کمالِ خاکساری سے
وہ عالم کیا جو اپنے علم پہ مغرور رہتا ہے

عبث ہے ماہ سیماؤں سے امیدِ وفا رکھنا
کہ اُن کی مملکت میں جور کا دستور رہتا ہے

خدا کا شکر ہے کہ بادۂ اسرارِ الفت سے
مرا پیمانۂ شعر و سخن معمور رہتا ہے

یہ وارثؔ بھی پرستارِ جمالِ یار ہے لیکن
وصال و ہجر کے جھگڑوں سے کوسوں دور رہتا ہے

مطبوعاتِ جدیدہ

تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۴۴ مجلد، قیمت ۱۵ ارو پیہ

پتہ۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، پوسٹ باکس ۱۱۹، لکھنؤ۔

"اسلام ایک ابر کرم تھا، اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا۔" اس کے گوناگوں انعامات سے تمام نوع انسانی متمتع ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی ایک نعمت تھی، اور آپ کی امت بھی دنیا کے لئے سراپا خیر و برکت تھی، اس کے قدم جس سرزمین پہ پڑے وہ گل و گلزار ہو گئی، اور مذہب و عقیدہ تہذیب و معاشرت اور سیاست و تمدن کوئی چیز بھی اس کے اثرات سے خالی نہیں رہی، یہ کتاب نامور عالم و مصنف اور مشہور داعی و مفکر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے گہربار قلم کا تازہ افادہ ہے اسمیں دنیا پر اسلامی عطایا اور بخششوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو مولانا کا محبوب موضوع ہے اور اس پر وہ اپنی تصنیفی زندگی کی ابتدا ہی میں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" نامی معرکۃ الآرا کتاب لکھ چکے ہیں اور اپنی دعوتی و تبلیغی تقریروں اور علمی و دینی اجتماعات میں بھی وہ اس پر برابر اظہار خیال فرماتے رہے ہیں، مگر زیر نظر کتاب میں انھوں نے اپنی گوناگوں مشغولیتوں کی وجہ سے انتخاب و اختصار سے کام لیا ہے، اور دنیا کو اسلام کی جانب سے عطا ہونے والے ان دس اہم اور بنیادی عطیات و انعامات کا ذکر کیا ہے، توحید کا صاف اور واضح عقیدہ، انسانی وحدت و مساوات کا تصور، انسانی شرافت و عظمت، عورت کے حقوق، نفسیات انسانی میں حوصلہ مندی اور اعتماد و افتخار کی آفرنیش، دین و دنیا کا اجتماع، دین و علم کے

درمیان مقدس دائمی رشتہ کا قیام و استحکام، علم و عقل سے اعتقاد کی ہمت افزائی، عالمی رہنمائی اور اور انفرادی و اجتماعی اخلاق کی نگرانی کرنے والی امت کا ظہور، عقیدہ و تہذیب کی عالمی وحدت، فاضل مصنف نے قرآنی آیات و احادیث سے اسلامی تعلیم پیش کرکے واشگاف انداز میں ثابت کیا ہے کہ یہ سب چیزیں دنیا کے لیے اسلام کا بیش بہا عطیہ و انعام ہیں، اور ان کے انسانی زندگی پر دوررس اثرات و نتائج مترتب ہوئے، اس سلسلہ میں ان امور کے بارہ میں اسلام سے پہلے کی مختلف قوموں اور ملکوں کے عقائد و نظریات بھی بیان کئے ہیں، اس تقابل سے اسلام کے عطیہ و برکت کی خوبیاں اور خصوصیات اور اس کی عظمت و اہمیت زیادہ نمایاں ہو گئی ہے۔

یہ کتاب عربی زبان میں لکھی گئی تھی، مولوی شمس تبریز خاں صاحب نے اس کو اردو کا جامہ پہنایا ہے، ترجمہ میں مصنف کے مخصوص اسلوب و طرز نگارش، زور بیان اور روانی اور داعیانہ و حکیمانہ انداز کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کی ہے، لیکن آیتوں کے ترجمہ میں کہیں کہیں تسامح ہو گیا ہے جیسے صفحات ۲۲، ۶۹، ۷۱، ۷۲، ۹۶ اور ۱۱۲ پر، توقع ہے کہ لائق مترجم اپنی بالغ نظری سے خود ان کی تصحیح کریں گے، ص ۳۶ اور ص ۱۱۳ پر بعض فقروں اور لفظوں کے ترجمے چھوٹ گئے ہیں۔

مسلمانوں کے مسائل و جذبات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے } از۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۶ قیمت تین روپیہ۔ پتہ۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ باکس ۱۱۹، لکھنؤ۔

یہ کتابچہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اس گفتگو پر مشتمل ہے، جو دانشوروں اور صحافیوں کے ایک منتخب مجمع کے سامنے دلی میں کی گئی تھی، اس میں پہلے ہندوستان کے مختلف فرقہ و مذہب کے لوگوں کو ایک دوسرے کے احساسات و جذبات سے واقف ہونے اور ان کے مسائل و معاملات کو سمجھنے کی ضرورت و اہمیت بتائی ہے، پھر عقیدہ و مذہب، دینی تعلیم جس میں دوسرے درجہ میں اردو بھی

شامل ہے، مسلم پرسنل لا، نبی اکرم، قرآن مجید، مسجدوں اور مقامات مقدسہ (مکہ و مدینہ) کے بارہ میں مسلمانوں کے شدید جذباتی تعلق کا ذکر کیا ہے، اور اس کا لحاظ کرنے کو حق پسندی، حب الوطنی اور ہم آہنگی کا تقاضا بتایا ہے، اسی گفتگو میں ظلم و تشدد، فرقہ پرستی و جارحیت، اخلاقی و انتظامی انتشار رشوت اور بدعنوانی کو ملک کے لئے زبردست خطرہ قرار دیا ہے، اور ہندوستانی پریس اور اخبار نویسوں کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے واقعات کی رپورٹنگ اور مختلف فرقوں اور جماعتوں کی شکایات و مطالبات کی روداد پیش کرنے میں رنگ آمیزی اور جانبداری سے بچنے کا مشورہ دیا ہے، اس کتابچہ کی ہر سطر سے مولانا کے اخلاص، دردمندی، حب الوطنی، انسان دوستی، قوم کی خیرخواہی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے بے چینی و بے قراری کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ ملک کے ذمہ دار اور سنجیدہ افراد کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔

معاشرہ کی مہلک بیماریاں اور ان کا علاج } تالیف شیخ احمد بن حجر، ترجمہ مولانا نصیر احمد ملی تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰، مجلد، قیمت ۵۰ء۳ روپیہ۔ پتہ، دار المعارف، ۱۳۔ محمد علی بلڈنگ، بھنڈی بازار، بمبئی ۳

الدار السلفیہ بمبئی کا مشہور اشاعتی ادارہ ہے، وہ مولانا مختار احمد ندوی کی نگرانی میں برابر اصلاحی و دینی کتابیں شائع کر رہا ہے، اس نے عربی کی متعدد ضخیم کتابیں اور عربی کتابوں کے اردو ترجمے بھی شایع کئے ہیں، حکومت قطر کے مفتی و قاضی شیخ احمد بن حجر کی اکثر کتابوں کے اردو ترجمہ کی اشاعت کا سہرا بھی اسی کے سر ہے، زیر نظر کتاب بھی شیخ کی عربی تصنیف "تطہیر المجتمعات من ارجاس الموبقات" کا اردو ترجمہ ہے، اس میں معاشرتی زندگی میں پھیلی ہوئی برائیوں کا تذکرہ کرکے ان کے ازالہ و اصلاح کی تلقین کی گئی ہے، شریعت کی اصطلاح میں انہی برائیوں کا نام کبائر (بڑے گناہ) ہے، لائق مصنف نے اس کتاب میں اصلاً کبیرہ گناہوں کی مذمت و شناعت بیان کرکے ان کا علاج

بتایا ہے، شروع میں تین مقدمے ہیں، پہلے مقدمہ میں گناہ کی قسموں صغیرہ و کبیرہ کی تعریف، کبائر کی تعداد اور اس بارہ میں اہل علم کے اختلاف رائے وغیرہ کا ذکر ہے، دوسرے مقدمہ میں گناہوں کے نقصان اور ان کے برے اثرات اور ان کی سزاؤں کی تفصیل دی گئی ہے، تیسرا مقدمہ ان آیات و احادیث پر مشتمل ہے، جن میں نیکوکاروں کے جنت میں عیش و آرام اور گنہگاروں کے لئے دوزخ میں تکلیفوں اور شدتوں کا تذکرہ ہے، اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، اس میں، کبائر کا ذکر اور ان کی ممانعت اور نقصان کے بارہ میں آیات و احادیث درج ہیں، مصنف نے کبائر کی فہرست میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے آل و اصحاب کی زندگی کی فلم بنانے کو بھی گنایا ہے، اور لکھا ہے کہ رسولؐ کی عظمت و توقیر امت پر فرض ہے، اور آپ کی زندگی کی فلم بنانا آپ کے ساتھ کھلا ہوا استہزا، مذاق اور توہین ہے، اور فلم بنانے والوں کی اکثریت لہو و لعب کی شیدائی جھوٹی اور مکار ہوتی ہے، اور کسی منظر کی فلمبندی کی غرض و غایت تمسخر اور مذاق ہوتا ہوتا ہے، اس لئے یہ سراسر کفر و زندقہ ہے، انھوں نے جاندار چیزوں کی تصویر بنانا اور انھیں گھروں یا دوکانوں میں لٹکانا کو بھی کبیرہ گناہ میں شمار کیا ہے، لیکن اس میں اور بعض دوسرے مسائل میں جو دلائل تحریر کئے گئے ہیں، وہ زیادہ صریح نہیں ہیں، اس لئے ممکن ہے دوسرے لوگ انھیں مصنف کی شدت پر محمول کریں، علاوہ ازیں کبائر کی تحدید بھی مشکل ہے، سلف سے اس کے بارہ میں نہ تو صریح اقوال منقول ہیں اور نہ ان کی تعداد پر ان کا اتفاق ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ فاضل مصنف نے جن مفاسد کی نشاندہی کی ہے، ان سے پورا معاشرہ مسموم اور تباہ و برباد ہو رہا ہے، اس اعتبار سے اس کتاب کی اشاعت ایک اہم اصلاحی و دینی خدمت ہے، ترجمہ اچھا ہے، تاہم کہیں کہیں زبان اور معیاری ہونی چاہئے تھی، ص ۲۴۳ پر ادجاع کا ترجمہ بھڑک کیا ہے، یہ وجع کی جمع ہے، جس کے معنی تکلیف کے ہیں۔

روح اخلاق:- مرتبہ جناب ریاض الدین احمد صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۷۰، مجلد مع گردپوش، قیمت ۱۶ روپیے، پتہ: دینی تعلیمی کونسل اترپردیش، ۹۹ - گوئن روڈ، لکھنؤ - ۱

جناب ریاض الدین احمد صاحب سابق پرنسپل مجیدیہ انٹر کالج الہ آباد اب دینی تعلیمی کونسل اترپردیش کے جنرل سکریٹری ہیں، ان کی زندگی درس و تدریس میں گذری ہے، اور انھیں تعلیم و تربیت کے مسائل کا براہ راست تجربہ اور ان سے اچھی واقفیت ہے، ان کا دل دین و ملت کے درد اور قلب قوم و ملت کی اصلاح و خیرخواہی کے جذبہ سے معمور ہے، اس لئے مسلمانوں اور خصوصاً ان کی نئی نسل اور طلبہ کی اصلاح و تربیت کے لئے وہ زیادہ فکرمند رہتے ہیں، یہ کتاب اسی فکرمندی کا نتیجہ ہے، اس زمانہ میں تعلیم کا معیار جس قدر پست ہے اس سے زیادہ تربیت کا نظام ابتر ہے، طلبہ کی بے راہ روی اور بدعنوانی سے معاشرہ اور ملک کا حال نہایت درہم برہم ہو رہا ہے، مصنف نے طلبہ کی دینی و اخلاقی اصلاح اور ذہنی و دماغی تربیت کے خیال سے اس کتاب میں دلچسپ اور موثر واقعات سادہ اور سلیس زبان میں قلمبند کئے ہیں، اس سے خدا کے خوف، اس پر اعتماد و یقین، دین سے تعلق اور آخرت کے تصور میں اضافہ ہوتا ہے، حسن عمل علوئے اخلاق، والدین کی اطاعت اور پڑوسیوں کے حقوق کو ادا کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، بزرگان دین سے عقیدت بڑھتی ہے، خلق کی خدمت اور نفع رسانی کا ولولہ اور شوق پیدا ہوتا ہے، دنیا سے بیزاری اور معیوب عادتوں اور برے اخلاق سے نفرت ہوتی ہے، اس لئے اسکا مطالعہ طلبہ کے اخلاق و اعمال کو بنانے اور ان کی سیرت و کردار کو سنوارنے اور پاکیزہ اور صالح معاشرہ کو فروغ دینے میں مدد و معاون ثابت ہوگا، اگر اسلامیہ اسکولوں اور مسلم تعلیمی اداروں کے طلبہ کو اس میں درج واقعات کو روزانہ چند منٹ سنانے کا اہتمام کیا جائے تو یہ طریقہ و عقائد

ارشاد سے زیادہ موثر اور سود مند ہوگا، کتاب میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں، جیسے بشر حافی کو بشیر حافی، شیخ سری سقطی کو سقطی اور ابو طلحہ کو ابو طلعہ لکھا ہے۔

دنیا میں اسلام اور مسلمان :- ترجمہ و تالیف، جناب حافظ محمد نسیم قریشی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔ صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵ر ۲۵ پیسے۔ پتہ:- دانش محل بک سیلرز۔ امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔ نمبر ۱

زیر نظر کتاب دنیا کے مختلف علاقوں میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے عربی اور انگریزی اخبار و رسائل میں چھپنے والے مضامین کا اردو ترجمہ ہے، یہ کل چودہ مضامین کا مجموعہ ہے، پہلے مضمون میں آسٹریلیا میں اسلام اور مسلمانوں کا حال بیان کیا ہے، دو مضامین یورپ کے دو ملکوں یونان اور فرانس میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کا مرقع پیش کرتے ہیں، براعظم افریقہ سے چار مضامین ہیں، ان میں مالی، وسطی افریقہ، جنوبی افریقہ اور مشرقی افریقہ میں اسلام اور مسلمانوں کی سرگرمیاں دکھائی گئی ہیں، مشرقی ایشیا کے مندرجہ ذیل سات ملکوں میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جاپان، تھائی لینڈ، چین، ملیشیا، نیپال، جنوبی کوریا، مالدیپ، ان سب مضامین میں ان ملکوں کے مختصر طبعی و قدرتی، تاریخی و جغرافیائی اور معاشرتی و سیاسی حالات اور ان میں آباد لوگوں کے مذاہب و عقائد کا تذکرہ کرنے کے بعد ان کی آبادی، رقبہ، مسلمانوں اور غیر مسلموں کی تعداد، مقامی زبان، پیداوار اور ذرائع معیشت وغیرہ کا ذکر ہے، اور یہ بتایا گیا ہے، کہ ان میں اسلام کی اشاعت کیسے ہوئی؟ اس سلسلہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ میں حصہ لینے والے افراد اور اصلاحی و دینی خدمات انجام دینے والے اداروں اور تنظیموں کی مساعی کا ذکر بھی آگیا ہے، اور مسلمانوں کے دینی، اخلاقی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی حالات کے علاوہ عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں مسیحی استعمار اور ریشہ دوانی اور دوسرے مذاہب کے لوگوں سے مسلمانوں کے تعلقات کا جائزہ

بھی لیا گیا ہے، مسلمانوں کے مدارس، مساجد اور انجمنوں کا تذکرہ بھی ہے، اس پر بھی بحث و گفتگو کی گئی ہے کہ ان ملکوں میں اسلام کی اشاعت و فروغ کے آئندہ امکانات کیا ہیں؟ اس ضمن میں اشاعت اسلام میں حائل دشواریوں اور مسلمانوں کو درپیش مسائل و ضروریات کی جانب مسلمانوں کی بین الاقوامی برادری کی توجہ منعطف کرا کے مسلم حکومتوں اور ان کے با اثر افراد، جماعتوں اور اداروں کو ان کی امداد کی ترغیب دلائی گئی ہے، یہ کتاب مفید ہے، اور اس سے دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمانوں کے حالات و مسائل اور ان کی سرگرمی اور جد و جہد کا ایک حد تک اندازہ ہوتا ہے، اگر اس میں انگلستان اور امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں معلومات بھی فراہم کئے گئے ہوتے تو اس کی اہمیت بڑھ جاتی، ایک جگہ "جدید اسلامی تہذیب" (صفحہ ۲۵) لکھا ہے، یہاں جدید کا لفظ نامناسب ہے، ایک جگہ باشندہ کے بجائے ہندی لفظ باسی (صفحہ ۱۵) استعمال کیا ہے، صفحہ ۱۵ پر نامعلوم مقامات اور صفحہ ۱۲۴ پر مسلمانوں کی مضبوط روابط لکھا ہے جو ممکن ہے کتابت کی غلطی ہو۔

مقالات انور :- مرتبہ، جناب مسعود انور علوی کاکوری، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۸، مجلد مع گرد پوش قیمت تین روپے۔ پتہ: کتب خانہ انوریہ، تکیہ شریف کاظمیہ کاکوری، ضلع لکھنؤ۔

یہ گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے، اکثر مضامین تصوف اور صوفیہ کے بارہ میں ہیں، چند مضامین ادبی نوعیت کے بھی ہیں۔ ہول الذکر نوعیت کے مضامین میں خوارق و کرامات کا ذکر زیادہ ہے اور انکے اکثر مندرجات بھی محل نظر ہیں، مصنف میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت ہے، مگر انھیں احتیاط و سلامت روی کو مدنظر رکھنے اور مضامین کی کمیت کے بجائے کیفیت کی جانب زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

دعوت اسلام، ظالم کون ہے؟ اکابر ملت کا پیغام، } مرتبہ، ۱ و ۲ مولانا محمد عبد الملک جامی و مرتبہ سوم، مولانا نسیم احمد غازی و مولانا افتخار فریدی، تقطیع متوسط کاغذ و طباعت اچھی صفحات ۳۲، ۴۰ و ۲۶۔ پتہ مولانا افتخار فریدی، فریدی بلڈنگ، سنبھلی گیٹ، مراد آباد۔

جناب مولانا افتخار فریدی کو دعوت و تبلیغ دین کے کام سے خاص دلچسپی اور طبعی مناسبت ہے اور وہ اسلام کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں کی اصلاح و سربلندی کے لیے برابر فکرمند بھی رہتے ہیں اسی مقصد سے وہ مفید دینی و اصلاحی کتابچے خود بھی مرتب کرکے اور دوسروں سے بھی مرتب کراکے شائع کرتے رہتے ہیں، یہ تینوں کتابچے بھی ان کے دعوتی شوق و ذوق اور تبلیغی جوش و جذبہ کے نتیجہ میں شائع ہوئے ہیں، اول الذکر دونوں رسالے مولانا محمد عبدالملک جامعی کے قلم سے ہیں، جو مراد آباد کی سکونت ترک کرکے عرصہ سے مدینہ منورہ میں آباد اور مختلف دینی و دعوتی سرگرمیوں میں منہمک اور مدرسہ تحفیظ القرآن کے نگراں ہیں، مولانا فریدی کی طرح اسلام کی دعوت و اشاعت اور امت کی صلاح و فلاح کے لیے انھوں نے بھی اپنی زندگی وقف کردی ہے، پہلے کتابچہ میں ہر مسلمان کو اسلام کا داعی و مبلغ بننے کی تلقین کی ہے، اور یہ دعوت دی ہے کہ اسلام کا پیغام حق و صداقت سنا کر پوری دنیا کو بنانے اور سنوارنے کے لیے اسے کمربستہ رہنا چاہیے، دوسرے کتابچے میں ایک بے ادب اور گستاخ کے اس نارو انقرہ "خدا ظالم ہے، اور ظالموں کا ساتھ دیتا ہے" کی مختلف انداز سے تردید کرکے دکھایا ہے کہ دراصل خود انسان ظالم ہے، اس ضمن میں خدا کی ربوبیت رحمت، حکمت، غیبی امداد، مظلوموں کی دستگیری اور ظالموں سے انتقام لینے کی عجیب عجیب صورتوں کا ذکر کیا ہے، اس میں ایک جگہ مولانا شبلیؒ کے بارہ میں لکھا ہے کہ انکے اولاد نہ تھی (ص۱۲۱)، یہ صحیح نہیں ہے انکے بیٹے بیٹیاں دونوں تھیں، تمام لوگوں کے ناموں کے ساتھ مولانا لکھنے کا اہتمام کرتے ہیں یہی اہتمام مولانا شبلیؒ کے نام کے ساتھ بھی کیا جاتا تو بہتر تھا، تیسرے رسالہ میں اساتذہ و طلبائے مدارس کے لیے مفید اور بیش قیمت ہدایتیں اور نصیحتیں درج ہیں ادھر عربی مدارس جس صورت حال سے دوچار ہیں اسکے پیش نظر اس رسالہ کا مطالعہ خاص طور پر بہت ضروری ہے، ان رسائل کی حیثیت کسی مرتب کتاب جیسی نہیں ہے اسلئے ان میں اصل موضوع سے ہٹ کر بھی بعض باتیں لکھی گئی ہیں تاہم وہ بھی نہایت مفید ہیں یہ تینوں رسالے دینی و اصلاحی حیثیت سے مفید، موثر اور دلپذیر ہیں جو بڑی دلسوزی، دردمندی اور اخلاص و نیک نیتی سے لکھے گئے ہیں ہر مسلمان کو انھیں خود بھی پڑھنا چاہیے، اور ان کی توسیع اشاعت میں بھی حصہ لینا چاہیے۔

جلد ۱۳۸ ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۶ء عدد ۲

مضامین